لکھنؤ

تعمیرِ حیات

پندرہ روزہ

اللہ
نور السمٰوٰت والارض

"مطالعہ کے سلسلہ میں

مولانا عبدالباری صاحب ندوی کی ایک چھوٹی سی

کتاب "مذہب وعقلیات" پر نظر پڑی جس کو ذوق وذہن

نے پورے طور پر اپنا لیا۔ اس رسالہ سے عقل ونقل کے حدود اور تجربہ وعلم انسانی کی نارسی ناپائیداری

اور انبیاء علیہم السّلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا جو مطالعہ میں بہت کام آیا اس کے بعد قدیم وجدید فلسفہ اور

اسکی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا پڑھا مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تزلزل واقع نہیں ہوا بلکہ جس قدر پڑھا "ان ھم

الا یخرصون" اور "کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما یأتھم تاویلہ" کی

تفسیر وتوضیح ہوتی رہی۔"

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

(محسن کتابیں ص ۱۸۱)

Regd. No. L W/NP 56 FORTNIGHTLY Phone : 22948

TAMEER-E-HAYAT

Darululoom Nadwatululama, Lucknow (India)

مکتبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء کی چند مطبوعات

صحبتے با اولیاء

عہد حاضر کے مشہور عارف باللہ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کے ملفوظات کا حسین گلدستہ

مترجمہ: مولانا تقی الدین ندوی مظاہری

اس کتاب میں حضرت شیخ الحدیث دامت برکاتہم کے وہ مجلسی ملفوظات اور ارشادات ہیں جن سے اصلاح نفس، فکر آخرت اور ایمان ویقین کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ و نیز تصوف وسلوک کے رموز وآداب دلنشین ہوتے ہیں، نہایت سبق آموز، معلومات افزا، ایمانی روح پرور اور حیات آفریں۔

قیمت مجلد صرف سات روپے

تذکرہ حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی

از: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

چودھویں صدی ہجری کے مشہور ومعروف بزرگ عالم حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کی سوانح حیات، حالات، ارشادات، اور ملفوظات دل پر اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتے، صاف معلوم ہوتا ہے کہ تصوف شریعت سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ بلکہ عین شریعت کی روح ہے۔

مولانا موصوف کے متعلق مولانا تھانویؒ، مولانا محمد علی مونگیریؒ، مولانا سید عبدالحیؒ کے تاثرات بھی اس کتاب میں شامل ہیں۔

قیمت مجلد: چار روپے

محدثین عظام اور انکے علمی کارنامے

مؤلفہ، مولانا تقی الدین ندوی مظاہری — مقدمہ، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

● ائمہ اربعہ وارباب صحاح ستہ اور امام طحاوی کا تحقیقی تذکرہ۔ ● محدثین عظام کے علمی کارنامے اور تصنیفات پر سیر حاصل بحث، ● تاریخ تدوین حدیث اور محدثین عظام کی کوششوں کا ذکر۔

نیا اڈیشن ترمیم واضافہ کے ساتھ۔ پہلے سے کہیں بہتر، کتابت وطباعت عمدہ۔ صفحات ۳۰۰ — قیمت مجلد دس روپے

سوانح حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلویؒ

تالیف: مولانا محمد ثانی حسنی — مقدمہ: مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

داعی الی اللہ حضرت مولانا محمد یوسف صاحبؒ کی ایک ایسی مکمل اور مستند سوانح جس میں کاندھلہ اور جھنجھانہ کے خاندانوں کے حالات خصوصاً مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا ذکر خیر نیز تبلیغی جماعتوں کے مجاہدانہ کارناموں کی سرگذشت ہے۔

حضرت شیخ الحدیث کے تفصیلی حالات زندگی حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے

قیمت صرف پندرہ روپے

صدر یار جنگ

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی ماضی قریب کے ایک نمائندہ فرد اور ملت کا قیمتی سرمایہ تھے، وہ ایک جید عالم دین حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے مسترشد سلطنت آصفیہ حیدرآباد کے صدر الصدور ایک خاندانی رئیس اور ساتھ ہی مشرقی تہذیب وتمدن کا نمونہ اور اردو کے ایک صاحب طرز ادیب تھے۔

یہ سوانح ملی تاریخ کی ایک اہم کڑی اور قومی ضرورت کی تکمیل ہے۔

قیمت مجلد: پندرہ روپے

مطبوعات مکتبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء ایک نظر میں

نمبر	نام کتاب	حصہ	قیمت	نمبر	نام کتاب	قیمت
۱	قصص النبیین	اول	١-٣٥	١٦	علم الصرف	٣-٠٠
۲	قصص النبیین	دوم	٢-٠٠	١٧	العقیدة السنیة فی شرح العقیدة الحسنة	٣-٠٠
۳	قصص النبیین	سوم	٢-٧٠	١٨	جزیرة العرب	٧-٠٠
۴	القراءة الراشدة	اول	١-٨٠	١٩	تذکرہ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادیؒ	٤-٠٠
۵	القراءة الراشدة	دوم	٣-	٢٠	سیرت مولانا محمد علی مونگیریؒ	٨-٠٠
۶	القراءة الراشدة	سوم	٢-٥٠	٢١	قادیانیت	٦-٠٠
۷	منشورات		٦-٠٠	٢٢	صدر یار جنگ	١٥-٠٠
۸	مختارات من ادب العرب	اول	٦-٥٠	٢٣	سوانح مولانا محمد یوسفؒ	١٥-٠٠
۹	مختارات من ادب العرب	دوم	٧-٥٠	٢٤	محدثین عظام	١٠-٠٠
۱۰	الادب العربی بین عرض ونقد		٦-٠٠	٢٥	صحبتے با اولیاء	٧-٠٠
۱۱	معلم الانشاء	اول	٤-٠٠	٢٦	الطریق الی المدینة	٦-٠٠
۱۲	معلم الانشاء	دوم	٤-٥٠	٢٧	اردو عربی ڈکشنری	٩-٠٠
۱۳	معلم الانشاء	سوم	٣-٥٠	٢٨	طالبان علوم نبوت کا مقام	٦٠-٠٠
۱۴	تمرین النحو		٢-٥٠	٢٩	اسلام کی تعلیم	٢٠-
۱۵	تمرین الصرف		٢-٢٥	٣٠	نصیحة المسلمین	٦٠-٠٠

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی جملہ تصانیف کا بڑا مرکز: مکتبۂ دار العلوم ندوۃ العلماء پوسٹ بکس ۹۳ لکھنؤ

تعمیر حیات

لکھنؤ — پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

۱۰ و ۲۵ فروری سنہ ۱۹۷۶ء — ۹ و ۲۴ صفر سنہ ۱۳۹۶ھ

جلد: ۱۳ — عام شمارہ: ۵۰ پیسے

شمارہ: ۷ — سالانہ: بارہ روپے

اس شمارے کی قیمت ایک روپیہ

مولانا عبدالباری ندویؒ

ندوی برادری کی بزرگ ترین شخصیت،
مولانا شبلی نعمانیؒ کے آخری شاگرد،
مرشد تھانویؒ کے مجاز بیعت

"ایک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے"

یوم جمعہ ۳۰ جنوری سنہ ۱۹۷۶ء کی صبح

مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ اپنی عمر کے ۹۰ سال اس عالم فانی میں گزارنے کے بعد رحلت فرما گئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا عبدالباری ندویؒ کے انتقال کے ساتھ ایک عہد کا خاتمہ ہو گیا۔ وہ علامہ شبلی کی سجائی علمی بزم کے آخری چراغ تھے۔ ہمارے علم میں اب برصغیر میں شاید ہی کوئی ایسی معروف شخصیت حیات ہو جس کو براہ راست مولانا شبلیؒ سے شرف تلمذ حاصل رہا ہو۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندویؒ کے مابعد علامہ شبلی کے ممتاز شاگردوں کی فہرست میں مولانا عبدالباری ندوی کا نام لیا جاتا ہے۔ مولانا عبدالباری ندویؒ اپنے دور کے ذہین اور عبقری شخصیت تھے۔ بات کی تہ تک پہونچنے اور کام کی چیز اخذ کرنے کی ان میں غیر معمولی صلاحیت تھی، یہی وجہ ہے کہ علمی دنیا میں انہوں نے اپنی انفرادیت منوالی۔ فلسفۂ جدید اور طبعیات سے انہیں دلچسپی تھی مگر ان کا علم و مطالعہ تقلیدی نہیں تھا بلکہ اس میں بھی انہوں نے ناقدانہ نظر اور خذ ما صفا ودع ما کدر کے اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ ان کے اسی امتیاز اور خصوصیت کی وجہ سے فلسفہ بقول مولانا شروانیؒ "ان کے ہاتھ پر ایمان لے آیا تھا۔"

مولانا عبدالباری ندویؒ نے جب جامعہ عثمانیہ کے شعبۂ فلسفہ کی کرسی صدارت کو رونق بخشی تو خود یہ فرماتے ہیں کہ "فلسفہ کے طلباء ایمانیات سے بہت دور جا پڑے تھے مگر الحمدللہ جب میں نے کلاس لینی شروع کی تو نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم طلباء میں بھی اسلام کے بنیادی اصولوں پر گہرا یقین پیدا ہو گیا تھا۔"

دوسرا واقعہ یہ بتایا کہ "میں نے فلسفۂ جدید کو قرآن مجید کی روشنی میں پڑھانے کا جب اپنا ارادہ ظاہر کیا تو اس وقت کے جامعہ عثمانیہ کے چانسلر سر اکبر حیدری نے (جو ریاست حیدرآباد کے وزیر اعظم بھی تھے) اس شرط پر منظور کیا کہ میں اس سلسلے میں ڈاکٹر اقبالؒ کو مطمئن کر کے ان کا تصدیقی خط لاؤں، یونیورسٹی نے اپنے مصارف پر خاص اس مقصد کے لئے ڈاکٹر اقبالؒ کی خدمت میں لاہور بھیجا۔ میں نے جب اقبال مرحوم کے سامنے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا تو وہ بہت متاثر اور مطمئن ہوئے اور انہوں نے اپنے تصدیقی خط میں لکھا کہ: — "یہ شخص قرآن مجید کی روشنی میں فلسفۂ جدید کی تعلیم بخوبی دے سکتا ہے۔"

ڈیکارٹ، برکلے اور کئی فلاسفہ کو اردو داں حضرات سے روشناس کرانے میں مولانا عبدالباری ندویؒ نے وہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ اردو زبان اور اردو داں حضرات ان کے اس گراں قدر علمی عطیے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مولانا عبدالباری ندویؒ نے انگریزی تعلیم باقاعدہ کسی کالج یا یونیورسٹی میں حاصل نہیں کی تھی تاہم ذاتی محنت و مطالعہ اور علم و فلسفہ سے دلچسپی کی وجہ سے وہ جس خوبی سے فلسفے کی انگریزی کتابوں کا اردو ترجمہ کرتے تھے وہ اچھے اچھے انگریزی داں حضرات سے ممکن نہ ہوتا۔ ایک مرتبہ خود فرمایا کہ " دارالترجمہ حیدرآباد سے فلسفہ کی ایک انگریزی کتاب کے ترجمہ کے لئے معقول معاوضہ پر میری خدمات کے لئے کوشش ہوئی۔ میں اس زمانہ میں حضرت تھانویؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو چکا تھا اور طبیعت کا رجحان و میلان قطعاً بدل چکا تھا میں نے معذرت کر دی مگر دارالترجمہ کے ذمہ داروں کا اصرار برقرار رہا، میں نے ٹالنے کے لئے معاوضہ کی اتنی بڑی رقم طلب کی کہ جس کی منظوری میرے نزدیک ناممکن تھی مگر حیرت ہوئی کہ اس کثیر معاوضہ پر دارالترجمہ کی انتظامیہ نے مجھ سے ترجمہ کرانے کی تجویز پاس کی — اراکین کی اکثریت کی یہ رائے تھی کہ عبدالباری ندوی کے علاوہ ہندوستان میں اس کتاب کا بہتر اردو ترجمہ اور کوئی فاضل نہیں کر سکتا۔"

مولانا عبدالباری ندویؒ کے بلند علمی مقام کے بعد ان کی زندگی کا نظم و ضبط، اصول پسندی ..... معاملات کی صفائی اور دینداری ایسی مثالی چیزیں تھیں جن کی نظیر کم ملتی ہے۔ ان کی ان خوبیوں میں اس وقت جلا پیدا ہو گئی جب وہ مرشد تھانویؒ کے دامن تربیت سے وابستہ ہوئے —

وہ اپنے مرشد و مربی حضرت تھانویؒ کے عاشقوں میں تھے، وہ اپنی گفتگو میں، تقریر میں ہر موقع پر حضرت تھانویؒ کی حکیمانہ تربیت و اصلاح کا ضرور ذکر کرتے۔ "جامع المجددین" "تجدید تصوف و سلوک" "تجدید تعلیم و تبلیغ" "تجدید معاشیات" وغیرہ کتابوں کے ذریعہ انہوں نے حضرت تھانویؒ کے افکار و خیالات، اصول و نظریات، حکیمانہ طریقہ کار اور مجددانہ اصول تربیت و اصلاح پر بڑی مفصل روشنی ڈالی ہے۔

جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے وظیفہ یاب ہونے کے بعد وہ لکھنؤ میں بارڈنگ روڈ پر واقع اپنی عالیشان کوٹھی "شبستان سعادت" میں فروکش ہو گئے۔ اس زمانہ میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کے طلباء ان کی خدمت میں جاتے اور ان میں سے بعض ان کے درس قرآن مجید میں بھی شریک ہوتے جو ہفتہ میں تین دن ہوتا تھا اور فلسفۂ جدید تھانوی فکر اور عقل عام کو اپیل کرنے والی مثالوں کی آمیزش سے ایک مخصوص و مفید سلسلۂ درس کی حیثیت رکھتا تھا۔

مولانا عبدالباری ندویؒ اپنے علمی کمال، روشن دماغی اور خوشحالی کے باوجود خلوص و للہیت کی دولت اور محبت و معرفت الٰہی کی نعمت کے حصول کے لئے تمام عمر کوشاں رہے، ان کے اسی جذبہ نے انہیں حضرت تھانویؒ تک طالب علمانہ انداز میں پہونچایا۔ ان کی یہی خصوصیت تھی جو متعدی ہو کر دوسروں تک بھی پہونچتی تھی — راقم الحروف کو ان کے درس میں شرکت کا پہلا دن آج بھی کس طرح یاد ہے جیسے یہ گویا کل کی بات ہو۔

ہم تین یا چار طلباء سے آج سے بیس برس پہلے انہوں نے اپنا درس شروع کرنے سے پہلے دریافت کیا کہ "ندوہ میں پڑھنے کا کیا مقصد ہے؟" سوال کوئی پیچیدہ نہیں تھا۔ مگر کسی کا جواب انہیں مطمئن نہ کر سکا۔ ایک نے جواب دیا کہ عربی زبان و ادب میں ترقی مقصد ہے، دوسرے نے کہا دین کی خدمت وغیرہ۔ مولانا نے فرمایا کہ مومن کا مقصد زندگی "رضائے الٰہی" ہونا چاہیے۔

اپنی مادر علمی دارالعلوم ندوۃ العلماء سے انہیں گہرا تعلق تھا، ان کے سفر آخرت کی پہلی منزل بھی احاطۂ دارالعلوم ندوۃ تھی۔ ندوۃ کی مسجد میں نماز جنازہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے پڑھائی، اور تمام طلباء، اور اساتذہ نے اپنے ایک محبوب و محترم بزرگ کو الوداع کہا۔

مولانا عبدالباری ندویؒ اس نسل کے آخری نمائندے تھے جن کی دینداری، حقیقت، خلوص، علمی کمالات آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ رہیں گے، اللہ تعالیٰ انہیں اپنی آغوش رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور ہمیں اپنے فضل خاص سے ان کا بہتر بدل نصیب فرمائے۔

رحمۃ اللہ علیہ رحمۃ واسعۃ

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ہمشیرہ محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ .... رحلت فرما گئیں، انا للہ وانا الیہ راجعون — مرحومہ کی جس علمی اور دینی خانوادہ میں نشو و نما ہوئی تھی اس کی تمام صفات و خصوصیات کی وہ حامل تھیں، علمی اور ادبی ذوق، دینداری اور اصلاحی مسائل سے گہرا تعلق، خواتین کے ماہنامہ "رضوان" کی ادارت میں رہیں، حدیث کی مشہور کتاب "ریاض الصالحین" کی "زاد سفر" کے نام سے ترجمہ ان کی وہ خدمت ہے جو ان کے لئے ذخیرۂ آخرت ثابت ہوگی۔ مستقل مضمون صفحہ ... پر ملاحظہ فرمائیں۔

مکاتیب علامہ شبلی بنام مولانا عبدالباری ندوی

"گاہے گاہے باز خواں ایں دفتر پارینہ را"

(۱)

عزیزی،

خدا — تمہارے عزم و ارادہ میں استقلال و برکت دے —

ہمت بلند دار کہ پیش خدا و خلق
باشد بقدر ہمت تو اعتبار تو

میں نے جو کچھ کہا تھا وہ قطعی ہے، یہ ممکن ہے کہ کوئی عہدہ دار صاحب مخالفت کریں، اس کا ابھی کوئی قطعی فیصلہ میں نہیں لکھ سکتا، انشاء اللہ اوائل جولائی میں وہاں پہونچ جاؤں گا، موسم یہاں نہایت خنک اور خوشگوار ہے، شب کو رضائی کی ضرورت ہوتی ہے۔

وقف کے متعلق مسٹر جناح سے مفصل بحث ہوئی۔
یہاں ایک جلسہ بھی میری تحریک سے ہوگا، گورنر بمبئی وقف کے مؤید ہیں،
بحتری کا حماسہ ہاتھ آیا۔

شبلی، بمبئی

(۲)

عزیزی،

ہاں مجھ کو بہت تعجب ہوا کہ تم آئے اور فیض چلے گئے، میں نے دوبارہ دریافت تھا، اقبال بہت خوشی سے تم کو اپنے گھر پر رکھتے۔ افسوس تم علی گڑھ سے چلے گئے، غرض استقلال سے ایک جگہ جم کر رہو، آئندہ مراحل کے لئے بھی مجھ سے جو کچھ ہو سکتا ہے میں ہمیشہ موجود ہوں،

اب کی لیگ کو مجبوراً اپنی اسکیم (بظاہر) بدلنی پڑی، سلف گورنمنٹ کا حاصل کرنا رزولیشن میں داخل کیا گیا، اور باتفاق منظور ہوا ہم جب موقع تادیل کے لئے سوٹ ایبل کی قید بڑھا دی گئی، جلسہ کا عام رنگ جمہوریت کا تھا، گو اس میں مغالطہ بھی دیا گیا،

سیرت بدر تک پہونچی۔

(۳)

ہاں بھائی اب میں اپنا سایہ رہ گیا ہوں،

یہ حیرت انگیز بات ہے کہ بھوک بھی کم نہیں، لیکن اگر دونوں وقت کھاؤں تو کئی دن کھانے کے قابل نہیں رہتا،

علی گڑھ کے لڑکے اب ہم لوگوں سے بھی آگے ہیں، بلکہ سچ یہ ہے کہ ان کی حالت شورید گی تک پہونچ گئی ہے، آزاد وہاں جائیں تو لڑکے ان کی گاڑی کھینچیں۔

جموں سے ایک انجمن کا سخت تقاضا آیا ہے، اخیر مارچ میں کوئی جلسہ ہے، کشمیر کا ارادہ تو کرتا ہوں اور کشش کے اسباب بھی ہیں خصوصاً یہ کہ حکومت کے بڑے ارکان میرے دوست اور شاگرد ہیں، لیکن ماندگی، بیماری اور زیاں ہی ترسید، ایک دفعہ اس قدر صدمہ اٹھا چکا ہوں کہ اب تک نہیں سنبھلا۔

سیرت چل رہا ہے، اب نظر آتا ہے کہ واقعی ایک ایسی تصنیف کی سخت ضرورت تھی، یہ دوسری بات ہے کہ میں پورا کر سکوں گا، یا نہیں۔

چند اخلاقی اور تاریخی نظمیں لکھنی شروع کی ہیں، ایک دو الہلال میں نکلی ہیں، قرن اول کے اخلاق و احکام نظم میں آ جائیں تو اچھا ہے — آغا خاں کی بیماری۔

خوش درخشید ولے دولت مستعجل بود

اب کی مسلم لیگ کی صدارت میاں شفیع کو ملی، لوگ کہتے ہیں کہ رو رعایا و فرشتہ تاب ہے، لیکن جو

اس گنہگار کو درکار تھا ایسا ہی شفیع

شبلی، یکم مارچ ۱۹۱۳ء

(۴)

عزیزی،

السلام علیکم، آزاد کا ٹھکانا، وہ کشمیر جائیں تو زمانہ کو کیا کریں، یہ بلا ان کے ساتھ ہے، میں وہاں کے طیریا سے سخت خائف ہوں، اس لئے ہمت کر کے رک جاتا ہوں، غالباً منصوری جاؤں یا پھر دیکھا جائے، سیرت سادہ طور پر فتح مکہ و حنین تک پہنچ گئی، اب اطمینان سے اس کو دوبارہ دیکھنا ہے کہ چھپنے کے قابل ہو، عبدالسلام کو بھی بلا لیتا ہوں، امتحان کے بعد تا افتتاح اسکول تم کہاں رہو گے۔

الہلال کو گویا اب کی فتح ہوئی یعنی ڈیپوٹیشن ٹوٹ گیا، لیکن راجہ صاحب وغیرہ الٹے مجھ سے ناراض ہیں، حالانکہ میں نے اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی،

شبلی ۳۱ مارچ ۱۹۱۳ء

(۶)

عزیزی،

خط پہونچا، ہاں آنکھ خوب بہتر ہو گئی، یہ سال تو گیا جیتا رہا تو اگلے برس قدرح ہو گی، مئی تک تو ضرور بمبئی چلا جاؤں گا، پارسال اپریل میں گیا تھا، اپریل میں میرا کرہ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے، یاد رہے نے میرا صندوق جس میں مال کے نوٹ اور ضروری کاغذات تھے میرے نوکر کو ملا کر سرقہ کرا دیا، پولیس نے بھی یوں ہی تحقیقات کر کے اغماض کیا۔

شبلی، الہ آباد، ۹ مارچ ۱۹۱۳ء

(۷)

سلام علیکم،

جو خبریں تم نے سنیں، ایک بھی صحیح نہیں، اب میں کشمیر کے سفر کے قابل کہاں ہوں۔

از ضعف بہر جا کہ نشستیم وطن شد

شبلی، ۱۶ مارچ ۱۹۱۳ء

(۸)

عزیزی،

میں اب تک یہیں اعظم گڈھ میں رہا اور گھر جو تین چار کوس ہے، نہ جا سکا، ارادہ جانے کا تھا لیکن اتوار یا دوشنبہ تک تمہارا انتظار کروں گا، فرضاً اگر گھر گیا بھی تو اس وقت تک آ جاؤں گا، میں واقعات حال سے اس قدر افسردہ ہو گیا ہوں کہ اب کسی بات سے طبیعت شگفتہ نہیں ہوتی۔

شبلی، اعظم گڈھ
۱۶ اکتوبر ۱۹۱۳ء

ؒ اقبال احمد بی۔ اے وکیل الہ آباد، مولانا کے ایک عزیز۔ ؒ یعنی علی گڈھ کالج سے۔
ؒ مولانا ابوالکلام آزاد ؒ پہلی بار کشمیر جا کر مولانا سخت بیمار پڑ گئے تھے۔
ؒ آنریبل میاں محمد شفیع لاہور ؒ اس موقع پر مولانا نے جو نظم لکھی تھی اس کا ایک مصرعہ ہے۔
ؒ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم ؒ بھائی کی وفات

ؒ ایم اے عربی کی تکمیل کے بعد انگریزی کی تحصیل۔ ؒ محمد علی جناح بانی پاکستان

مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کی وفات سے ایک عہد ختم ہوگیا

دارالعلوم ندوۃ العلماء میں منعقدہ جلسۂ تعزیت میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ناظم ندوۃ العلماء کی تقریر۔

(نقل و ترتیب: دانیال احمد جعفری ندوی)

ملٹریز! حضرت مولانا عبدالباری صاحب جن کو ہم مدظلہ دامت برکاتہم کے الفاظ سے یاد کرتے تھے اب ان کے لئے ہم مرحوم و مغفور اور رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ رحمت کے الفاظ ہیں اور جن دعائیہ الفاظ کے استعمال کے لوگ عادی ہیں، اللہ تعالیٰ کی میزان میں وزن کے اعتبار سے یہ الفاظ زیادہ وقیع ہیں۔ زندگی فانی ہے چاہے جتنی طویل ہو۔

اللہ کا شکر ہے کہ انہوں نے بہت طویل زندگی پائی۔ اگرچہ قلبی تعلق اور جذبات کا فیصلہ اور تقاضہ یہ ہے کہ ایسی قابل احترام اور محبوب شخصیت کی زندگی کتنی ہی طویل ہو، طویل نہیں معلوم ہوتی، اور جب بھی اس کی آخری منزل آجائے تو افسوس ہی ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی اپنے عنفوان شباب میں اس دنیا سے رخصت ہوجائے تو غم زیادہ ہی ہوتا ہے، لیکن جو اپنی عمر طبعی پوری کرکے اس دنیا سے چلا جائے تو کسی قدر تسکین ہوتی ہے، جو الفاظ ہم ان کی زندگی میں استعمال کرتے تھے ان کا استعمال کرنا بھی ہمارا اخلاقی فرض اور اپنے تعلق کا اظہار تھا، لیکن ان الفاظ کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ کی میزان میں نتیجہ اور قدر و قیمت کے اعتبار سے وہ الفاظ زیادہ وزنی ہیں جنکی نسبت رحمت الٰہی سے ہو اس لئے کہ یہ زندگی تو حقیقت میں باعث رحمت ہی ہے ایک مومن کے نقطہ نظر سے بھی اور حقیقت پسند انسان کی حیثیت سے بھی یہ زندگی تو زحمتوں کا مجموعہ ہے اس لئے رحمت بہرحال رحمت ہے اور وہ چیز جو رحمت کا ذریعہ بن جائے اس چیز کے مقابلہ میں جو زحمتوں کو ساتھ لائے بہرحال قابل ترجیح ہے۔ اس لئے طبعی طور پر ہم کو کتنا ہی غم ہو ان الفاظ کے استعمال کرنے پر ہم کو تسکین ہونی چاہئے کہ خدا کے فضل و کرم سے اپنے حسن ظن اور ایمان اور آثار و قرائن کے اعتبار سے بھی ہم ان کو اللہ کی رحمت کا مستحق سمجھتے ہیں اور ہم اپنے اوپر حق سمجھتے ہیں کہ ہم ان کے لئے یہ الفاظ استعمال کریں۔

میرا ان سے ایک طرح کا خاندانی اور ذاتی تعلق تھا اور خاص طور پر میرے برادر محترم ڈاکٹر عبدالعلی صاحبؒ سے ان کا ایسا گہرا تعلق تھا جیسے حقیقی بھائیوں کا سا تعلق ہوتا ہے۔ اور اس شہر لکھنؤ میں شاید ان سے زیادہ عزیز دوست و رفیق ان کا کوئی نہ تھا۔ آخر تک وہ ان کو یاد کرتے رہے اور پھر مجھ کو ان سے استفادے کا بھی موقع ملا اور ان کی شفقت کی نظر مجھ پر ہمیشہ رہی۔ اس بنا پر میں ان کے احساسات اور نظریات سے واقف رہا ہوں۔ میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ وہ جلسۂ تعزیت کے حق میں نہیں تھے۔ اور وہ ان تمام رسمی جلسوں اور تقریبات کو ناپسند کرتے تھے جن کا ثبوت قرن اول اور صحابہ کرامؓ کی زندگی میں نہ ملے اور ان کا شرعی ثبوت مشکل ہوجائے۔ اس لحاظ سے مجھے بہت تردد ہوا کہ یہ جلسہ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ لیکن اس کے بعض ایسے مفید پہلو سامنے آئے جن کی بنا پر ہم نے اس کو مفید سمجھا، اور انہیں پہلوؤں کی طرف آپ لوگوں کو متوجہ کرنا ہے۔

پہلے تو ان کا مختصر سا تعارف کرادوں کہ ہمارے نو عمر طلباء کو ان کی تصنیفات اور ان کے علوم سے استفادہ کا موقع نہیں ملا اور تقریباً سات سال سے صاحب فراش تھے اور کچھ فاصلے کی وجہ سے جانا بھی نہ ہوتا ہوگا۔ اور ہمارے بہت سے بھائیوں کو ان کی زیارت بھی نہ ہوئی ہوگی۔ اس لئے میں ان کا تعارف کرادوں پھر ان پہلوؤں کی طرف متوجہ کروں گا جو ہمارے لئے بہت ہی سبق آموز بلکہ پیغام ہیں۔ ان کی زندگی کے یہ پہلو نہ درخشاں ہیں بہت کم ان کے معاصرین کی زندگی میں درخشاں ہوں گے۔

مختصر تعارف تو یہ ہے کہ گدیہ ضلع بارہ بنکی کے ایک انصاری اور بہت شریف خاندان کے وہ فرد تھے۔ ان کے والد صاحب حکیم عبدالخالق حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلیؒ سے جو حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلیؒ کے بعد بزرگان سلف کی یادگار اور علوم شریعت کے جامع اور اس کے آخری نمونہ تھے، ارادت کا تعلق رکھتے تھے۔ مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ نے خود سنایا کہ جب میں پیدا ہوا تو میرے والد صاحب مجھے لے کر مولانا محمد نعیمؒ کے پاس گئے اور کہا حضرت اس کا نام رکھیے تو مولانا نے فرمایا خالق باری نام کردو نا۔ خالق باری کتاب کا نام تھا تو ان کا نام عبدالخالق تھا اور ان کے بیٹے کا نام عبدالباری اس لئے خالق باری نام کردو تو عبدالباری نام رکھا۔ مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ نے ابتدائی تعلیم اس زمانہ کے شرفاء کے دستور کے مطابق گھر پر پائی۔ اس کے بعد ندوۃ العلماء میں جس کا قیام ابھی چند سال پہلے ہوا تھا داخلہ لیا۔ مولانا عبدالباری صاحبؒ کی ولادت ۱۳۰۶ھ؍۱۸۸۹ء کی ہے تو گویا جب وہ پڑھنے کے لائق ہوئے ہونگے تو ندوے کے قیام کو سات آٹھ سال ہوئے ہونگے۔

تو ندوے میں درجہ سوم میں ان کا داخلہ ہوا۔ اور انہوں نے ساری تعلیم یہاں مکمل کی۔ اس تعلیم کے دوران میں ایک آدھ سال بعض مضامین میں کمزوری کی وجہ سے ان کے والد حکیم عبدالخالق صاحب نے ان کو حکیم مولانا محمد ادریس صاحبؒ کی خدمت میں بھیج دیا جو ہمارے شیخ التفسیر مولانا محمد اویس صاحب ندوی کے دادا تھے۔ وہ ہمیشہ شکر گذاری کے ساتھ کہتے تھے کہ وہاں جانے سے مجھے بڑا فائدہ ہوا، دینی فائدہ بھی اور علمی اور روحانی فائدہ بھی۔ اور استعداد میں قوت استحکام پیدا ہوا اس کے بعد پھر ندوے آگئے۔ اس زمانے میں یہاں علامہ شبلیؒ کا دور تھا، شروع سے ان کی پیشانی پر ذہانت کے نمایاں آثار تھے اس لئے مولانا شبلیؒ کی نظر جن ہونہار طالب علموں پر پڑی ان میں سے مولانا عبدالباری صاحب بھی تھے۔ یہاں انہوں نے تعلیم کی تکمیل کی اور تعلیم کے دوران میں علامہ شبلیؒ اور ان کا ربط خاص رہا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالسلام ندویؒ کے بعد ان کو علامہ شبلیؒ کی مجلس میں اختصاص حاصل تھا۔ اور مولانا شبلیؒ کی دور بین نگاہ نے پہچان لیا تھا کہ یہ لڑکا بڑا ہونہار اور آگے چل کر طبقۂ علماء کا نام روشن کرنے والا ہوگا۔

مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کی خصوصیت یہی تھی کہ ذہانت کے ساتھ انہوں نے ادبی ذوق بھی پایا تھا اور یہی چیز مولانا شبلیؒ کی بارگاہ میں تقرب کا ذریعہ بنی۔ اور خاص طور پر فلسفے اور علوم عقلیہ سے مولانا کو مناسبت تھی، اور اس وقت یہاں پر بہت ہی جید اساتذہ مسند درس پر متمکن تھے۔ مولانا فاروق صاحب چریاکوٹیؒ، مولانا شبیر علی صاحبؒ وغیرہ ہندوستان کے صاحب درس اساتذہ یہاں درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے تھے۔ مولانا عبدالباری صاحبؒ نے یہاں سے باقاعدہ فراغت حاصل کی اور سند لی۔ ان کو فلسفہ کا خاص ذوق تھا جب فلسفۂ جدید کے حملے ہو رہے تھے علم کلام پر اور عقائد پر اور عقائد میں تزلزل آرہا تھا اور علامہ شبلیؒ اس ہلاول دستے کے بھی نائد تھے، جو اس طوفان کے مقابلے کے لئے سینہ سپر تھا تو مولانا عبدالباری صاحب نے بھی اسی مضمون کا انتخاب کیا کہ اس راہ سے دین کی بھی خدمت ہوسکتی ہے اور علم کی بھی خدمت ہوسکتی ہے۔

پھر انہوں نے فلسفۂ جدید کا گہرا مطالعہ کیا، انگریزی تعلیم جو یہاں ندوے میں حاصل کی تھی اس سے بھی فائدہ اٹھایا، مگر وہ کافی نہیں تھی، اس لئے انہوں نے مولانا عبدالماجد صاحبؒ دریابادی سے جو عمر میں دو تین سال چھوٹے تھے (اللہ انکی عمر میں برکت دے کل وہ جنازہ کی نماز میں بھی شریک تھے یہ حسن اتفاق ہی تھا) تو ان سے انہوں نے اپنی انگریزی کو ترقی دینے کی کوشش کی۔ اور مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی نے ان سے عربی میں مدد لی اور اس طرح یہ دونوں تبادل استاد ہیں اور ہر ایک دوسرے کا شاگرد ہے۔ پھر انہوں نے اپنے والد صاحب سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی انگریزی کو ترقی دینا چاہتے ہیں اور علی گڑھ جانا چاہتے ہیں تو والد صاحب نے جو سرا پا دینداری تھے اور حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کے تربیت یافتہ تھے اس زمانہ کے بزرگ اگر انگریزی پڑھنا جائز بھی سمجھتے ہوں تو کوئی نیک عمل نہیں سمجھتے تھے تو مولانا عبدالباری صاحب نے مجھ سے کئی بار کہا کہ میرے والد صاحب نے کہا کہ میں اس کار خیر میں مدد نہیں کرسکتا اور انہوں نے ہاتھ اٹھا لیا۔ تو مولانا شبلیؒ نے علیگڑھ غالباً اس وقت نواب وقار الملک کا دور تھا ان کو ایک خط لکھ دیا کہ یہ بہت ہونہار نوجوان ہیں اور ان کو فلسفہ سے خاص شغف ہے آپ ان کو اجازت دیں تو وہاں پر کلاسز کو اٹینڈ کرسکیں اور فلسفے کے مضمون میں شریک ہوں۔ تو بعض انتظامی دقتوں کی وجہ سے یہ نہیں ہوسکا تو پھر مولانا شبلیؒ نے ان کو کمشنر مقبول احمد صاحب قدوائی جو وہاں کمشنر مالیات یا ریلوے منسٹر تھے بھیجا تو انہوں نے وہاں طویل قیام کرکے اپنی انگریزی کو بڑھایا ان کی انگریزی ایسی ہوگئی تھی جب وہ پونا کے دکن کالج میں فارسی کے

پروفیسر مقرر ہوئے تو انہوں نے خود فرمایا کہ میں انگریزی حافظ کا کلام پڑھانے لگا۔ پھر انہوں نے فلسفہ کا مطالعہ بھی بہت بڑھایا اور انگریزی بھی ترقی پاتی رہی۔ چنانچہ فلسفہ کے ایک اچھے صاحب فکر عالم کی حیثیت سے ان کا تعارف ہوا۔ اس زمانہ میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس منعقد ہوئی غالباً احمد آباد میں اس وقت وہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کہلاتی تھی تو اس کے جلسے میں انہوں نے اپنا ایک معرکۃ الآرا اور تاریخی مقالہ پڑھا جو "مذہب و عقلیات" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اور جو بقول حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانویؒ کے اسلام کے دفاع کا ایک آہنی قلعہ ہے" اور بقول نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے اس رسالہ کو پڑھنے کے بعد انہوں نے کہا کہ "اس شخص کے ہاتھ پر فلسفہ مسلمان ہوگیا ہے: لوگوں کے ہاتھ پر فلسفی مسلمان ہوتے ہیں لیکن اس شخص کے ہاتھ پر تو فلسفے نے کلمہ پڑھا ہے"۔

جب وہ کئی سال تک پونا کے دکن کالج میں فارسی کے استاد رہے اور ان کی قابلیت کا سکہ قائم ہوگیا تو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد کو ایک فلسفہ کے استاد کی ضرورت تھی تو غالباً مولانا صدر یار جنگ کی خواہش سے وہ وہاں بلا لئے گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کسی یونیورسٹی میں کوئی کسی علمی ڈگری کے بغیر وہاں اسٹاف میں نہیں آسکتا تھا گویا ان کا تقرر ایک ناممکن سی بات تھی۔

لیکن مولانا عبدالباری صاحب ندوی اپنے علم کے زور اور اپنی قابلیت کے اثر سے وہاں استاد مقرر ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں میں وہاں انکے علم کی دھاک بیٹھ گئی اور دارالترجمہ سے ان کا تعلق قائم ہوا اور انہوں نے وہاں بڑے مفید کام انجام دئے اور ان کی ایک معرکۃ الآراء کتاب "فہم انسانی" کے نام سے شائع ہوئی اور برکلے کا ترجمہ کیا یہ فلسفے کی کتابوں کے کامیاب ترین تراجم کا نمونہ ہیں۔ ایک طرف تو تحریر کی شگفتگی اور قلم کی روانی جو انکو مولانا شبلی سے ورثے میں ملی تھی اور ندوے کی دین تھی پھر اردو کا شگفتہ ادبی ذوق اور زبان اور اس کے ساتھ علم کی سنجیدگی اور مطالعہ کی گہرائی ان سب نے ملکر ان کے تراجم کو نمونہ کی حیثیت دی، اور وہ وہاں مقبول ہوئے اور اس شعبے کے صدر بھی ہوگئے۔ اور اس وقت کے لائق ترین فلسفہ کے طالب علم بہت چمکے اور کامیاب ہوئے جیسے ڈاکٹر میر ولی الدین جن کا ابھی حال ہی میں انتقال ہوا۔ ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر رضی الدین یہ سب ان کے شاگرد ہیں، ہوسکتا ہے کہ میرے حافظے نے غلطی کی ہو لیکن بہرحال انہیں کے دور کے لوگ ہیں۔

اسی وقت جامعہ عثمانیہ میں دو استادوں کا جو خاص عالم تھے سکہ بیٹھا ہوا تھا گویا طوطی بولتا تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ۔ یہ دونوں صحیح معنی میں یار غار کہے جاسکتے ہیں۔ دونوں نے وہاں ایک مسجد میں حجرہ بنایا تھا اس لئے یار غار کہنا صحیح ہوگا، دونوں کی زندگی ایک دوسرے میں پیوست ہوگئی تھی، ایک طرح سے سوچنا، ایک ساتھ کھانا، ایک ساتھ ہواخوری کے لئے نکلنا، مشترک عادات، مشترک خیالات، مشترک مقاصد اور ایسا اتحار خیال جیسا مولانا مناظر احسن گیلانیؒ اور مولانا عبدالباری صاحب ندویؒ کا تھا کسی مدرسے میں کم دیکھا گیا ہے۔

مجھے وہ دور یاد ہے جب وہ چھٹیوں میں آیا کرتے تھے تو ہمارے یہاں پابندی سے آتے جمعہ کی نماز ہماری مسجد میں پڑھنے کا اہتمام کرتے تھے اور دوپہر کا کھانا بھی یہیں کھاتے تھے مولانا مناظر احسن بھی مولانا عبدالباری صاحب ندوی اور بھائی صاحب بھی۔

حیدرآباد میں بڑی عزت و وقار کے ساتھ انہوں نے اپنی ملازمت کے دن پورے کئے، اور دونوں بڑے عزت و وقار کے ساتھ اپنے اپنے وقت پر پہلے مولانا عبدالباری صاحب پھر مولانا مناظر احسن صاحب وظیفہ یاب ہوئے۔

یہ دونوں بزرگ عربی مدرسوں کے سند یافتہ تھے، مولانا گیلانیؒ دارالعلوم دیوبند کے فاضل تھے اور مولانا عبدالباری ندویؒ آپ کی اسی درسگاہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کے فارغ التحصیل۔

یونیورسٹیوں میں جامعہ عثمانیہ کا معیار سب سے بلند تھا اس کے حلقہ تدریس میں ایسے قابل اساتذہ جمع ہوگئے تھے کہ اس کی مثال ہندوستان کی کسی دوسری یونیورسٹی میں نہیں تھی۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، پروفیسر الیاس برنی، پروفیسر ہارون خاں شروانی، مولانا مناظر احسن گیلانی، ڈاکٹر حمید اللہ، ڈاکٹر میر ولی الدین جیسے لوگ۔

اس عثمانیہ یونیورسٹی میں خالص عربی مدرسے کا فاضل جس کے پاس کسی بھی یونیورسٹی کی سند نہیں صرف اپنی قابلیت کے بل بوتے پر تمام یونیورسٹی پر چھایا رہا، مجال نہیں تھی کہ کوئی شخص وہاں یہ کہہ دے کہ کوئی تحقیقاتی کمیشن بیٹھے اور دیکھے کہ کس کے پاس کونسی ڈگری ہے۔ کوئی بولتا تو مولانا عبدالباری صاحب کے بولنے سے پہلے وائس چانسلر اس کا منھ بند کر دیتا۔ اور کہتا کہ ہمیں فخر ہے مولانا عبدالباری پر اور مولانا گیلانی پر۔

اے میرے عزیزو! انہوں نے عربی مدرسے کی سند لی تھی۔ یہ نہیں کہ سندوں کا ڈھیر اور پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا ضروری ہو انہوں نے کبھی یہ سوچا تک نہیں حالانکہ وہ بہت آسانی کے ساتھ وہاں ڈاکٹر بن سکتے تھے نہ معلوم کتنوں کو انہوں نے ڈاکٹر بنایا ہوگا۔

ایک بات ان سے سیکھنے کی ہے عزیزو! کہ اصل چیز آدمی کی قابلیت ہے کسی بھی فن میں امتیاز پیدا کرلو، وہ جو فارسی کا مصرعہ ہے کہ

"عیب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی"

تم فن میں کمال پیدا کرلو مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے ایک رسالہ لکھا ہے "مذہب و عقلیات"، ساٹھ ستر صفحے کا بھی مشکل سے وہ رسالہ ہوگا، اس کی علمی دنیا میں ایک دھاک بیٹھ گئی۔ آج بھی اس کو پڑھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص کتنی گہری نظر رکھتا ہے۔

حضرت تھانویؒ نے ایک مرتبہ یہ رسالہ پڑھا تو کسی سے کہا کہ "یہ شخص عارف معلوم ہوتا ہے" یہ سند اس شخص کی ہے جو عارف باللہ تھا اور اپنے زمانے کا سرخیل مشائخ۔

یہ بات کہہ دو کہ یہ سب خیالی طلسم ہیں کہ جب تک ہمارے پاس ڈاکٹریٹ کی ڈگری نہ ہو اس وقت تک ہم کچھ نہیں کرسکتے۔ دو مثالیں ہمارے سامنے ہیں اور دونوں اسی درسگاہ سے تعلق رکھتی ہیں، ایک مولانا عبدالباری صاحب ندوی جن کے پاس صرف ندوے کی سند تھی اور وہ جامعہ عثمانیہ کے شعبہ فلسفے کا سب سے اونچی کرسی سے وظیفہ یاب ہوئے، اور دوسری مثال ہے ہمارے محبوب استاد شیخ خلیل عرب کی جن کی عربیت کا سکہ ایک زمانہ میں ہندوستان میں رواں تھا۔ ہم سب انھیں کے زیر احسان ہیں اور میں تو انکا پورا ممنون احسان ہوں جیسے کوئی بچہ الف بے سے شروع کرتا ہے اسی طرح میں نے عربی زبان اور عربی ادب نثر و نظم سب انہیں سے پڑھا۔ وہ ندوے کے فارغ تھے ان کے پاس بھی صرف ندوے کی سند تھی۔ اچھے اچھے باخبر لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ وہ ندوے کے باقاعدہ فارغ التحصیل فاضل تھے۔ وہ کلکتہ میں ڈھاکہ میں پھر لکھنؤ یونیورسٹی میں خدمت انجام دیتے رہے اور ان کے علمی رعب کا یہ عالم تھا کہ انگریز وائس چانسلر اور شعبوں کے سربراہ تک ان کے سامنے شاگردوں کی طرح بیٹھتے تھے۔ ایک بات مولانا عبدالباری صاحبؒ کی زندگی سے یہ سیکھنے کی ہے کہ اصل چیز آدمی کی قابلیت مطالعہ اور محنت ہے وہ اس پر کبھی شرمندہ نہیں ہوئے اور کہا ہو کہ کاش میں ڈگری یافتہ ہوتا۔

ہمارے دو نام ہمیشہ ایک ساتھ پڑھے جاتے تھے مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا عبدالباری ندوی میں ان دونوں کو پی۔ اے کہتا تھا، اس لئے کہ ایک زمانے میں مولانا عبدالماجد صاحب اپنے نام کے ساتھ بی۔ اے لکھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ اس سلسلے میں ایک صاحب سے بڑی بحث ہوئی وہ کہہ رہے تھے کہ مولانا عبدالباری صاحب بی۔ اے ہیں اور میں کہہ رہا تھا کہ ان کے پاس کوئی ڈگری نہیں ہے۔

بھائیو! دوسرا پہلو جو ہمارے لئے قابل استفادہ ہے اور ہماری آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے وہ یہ ہے کہ ان ایسا فلسفی، اتنا بڑا رمز شناس، ایسا متکلم، اتنا ذہین شبلی کا مایۂ ناز شاگرد، ندوے کا ایک روشن خیال فاضل۔ لیکن اس کے بعد جو چیز ان کی زندگی میں دیکھنے کی ہے وہ یہ کہ انہوں نے اس کی ضرورت محسوس کی کہ اپنی اصلاح کریں بلکہ اپنے کو مبتدی نہیں بلکہ ایک انجان آدمی تصور کرکے معالج کے حوالہ کردیں اور اس کا طفل مکتب بن جائیں اس کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کریں۔

یہ توفیق تو ہمارے زمانہ میں اللہ تعالیٰ نے دو آدمیوں کو دی ہے ایک علامہ سید سلیمان ندویؒ اور دوسرے مولانا عبدالباری ندویؒ اور اعلیٰ علمی مقام پر پہونچ گئے تھے۔ امام غزالیؒ کی طرح، امام غزالی تو حجۃ الاسلام تھے وہ لقب ان کے لئے مخصوص و مستقل ہے انکی زندگی کا ایک نمونہ تھا کہ وہ نقطۂ عروج پر پہونچے کہ بعد مورخین نے لکھا ہے کہ دربار خلافت سے ان کی مجلسیں آنکھیں ملاتی تھیں اور دو سو طلباء نہیں بلکہ فارغ التحصیل فضلاء ان کے درس میں بیٹھتے تھے۔ اور قال ابو حامد، یقول الغزالی کا ہر طرف چرچا تھا اس وقت انہوں نے اپنی یہ کمزوری محسوس کی کہ حسیات و بدیہیات پر جیسا یقین ہے غیبیات پر اس درجے کا یقین نہیں جب تک غیبیات پر اس درجہ کا یقین نہ ہو میرا ایمان مکمل نہیں۔ تاریخ دعوت و عزیمت میں مفصل لکھا گیا ہے المنقذ من الضلال میں تفصیل سے ہے میرا مشورہ ہے کہ ہر طالب علم اسے پڑھے۔ امام غزالی کو بڑھا ناگیا بلکہ بولنا بھی مشکل ہوگیا۔ بالآخر خاتمہ ہوا۔ ان کی بحث یہ نہیں ہماری ہوئی۔ تو لوگوں نے کہا کہ اسلام کو نظر لگ گئی کہ ایک ایسا نادر روزگار، فاضل یگانہ کی درس سے طبیعت اچاٹ ہوگئی ہے، اور کسی فکر یا خلل میں مبتلا ہوگیا ہے۔

طبیبوں نے دیکھ کر کہا کہ ایسی چیزیں ان پر مستولی ہوگئی ہیں کہ جنہوں نے پورے نظام جسم کو متاثر کردیا ہے اور کسی کام کے نہیں رہے۔ انہوں نے صحرا نوردی کی، برسوں تک خاک چھانتے رہے پھر اس کے بعد جامع اموی دمشق میں بیٹھ کر حقیقت کی تلاش میں مراقبے کرتے رہے، بہت مجاہدے کئے۔ آخر میں جب حقیقت کا سراغ ان کو مل گیا تو بغداد واپس آئے اور پھر قاہرہ اور بلاغیہ کر تدریس کرتا رہا انکیں۔ پہلے درس دیتا اور لکھتا کچھ اور تھا اب کچھ اور تھے ہمارے اس دور مادیت و الحاد میں امام غزالیؒ کی اسی طرح کے علو ہمت اور حسن طلب کی دو مثالیں ہمارے حلقہ میں ہمارے سامنے گزری ہیں، ایک مولانا سید سلیمان ندویؒ اور دوسرے مولانا

عبدالباری صاحب ندویؒ کی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ایک صاحب نے جو ہائی کورٹ کے جج رہ چکے تھے انہوں نے تعجب سے کہا کہ مولانا سید سلیمان صاحب ندوی جو علامہ شبلیؒ کے شاگرد ہو کر مولانا تھانویؒ کے مرید ہو گئے؟ مولانا تھانویؒ کو کون کا مرید ہونا چاہیے تھا۔ اور ندوی حلقہ میں بھی اس پر چہ میگوئیاں ہوئیں لوگوں نے سید صاحب کو خطوط لکھے۔ خود سید صاحب نے جا ہے سامنے کہا عجیب بات ہے کہ لوگ مجھے بڑا بھی مانتے ہیں اور احمق بھی سمجھتے ہیں اور مجھے مشورہ بھی دیتے ہیں کہ آپ کو تھانہ بھون نہیں جانا چاہیے تھا۔ آپ نے ندوہ کی توہین کی اور علامہ شبلیؒ کے نام کو بٹہ لگایا ان کا اعتماد حاصل کرنے کے بعد اور بے شمار محققانہ کتابوں کی تصنیف و تالیف کے بعد آپ دیوبند کے ایک عالم کے پاس گئے۔

امام احمد ابن حنبل رحمۃ اللہ سے کسی نے کہا کہ آپ ایسے شخص کے درس میں بیٹھتے ہیں جو آپ کے درس میں بھی شریک ہونے کے قابل نہیں تو انہوں نے جواب دیا، یا بنی انما یجلس الانسان حیث یجد صلاحۃ آدمی وہاں پر پہنچتا ہے جہاں اس کا فائدہ نظر آتا ہے۔

کیا ہمیں دل کے علاج کی ضرورت نہیں ہمیں اپنے دل کو حرارت سے بھرنے اور یقین سے بھرنے کی ضرورت نہیں؟ یہ مثالیں ہمارے سامنے کی ہیں۔ علامہ سید سلیمان ندویؒ جو ہمارے عہد کے عظیم ترین مصنف تھے، یہ میں سمجھ بوجھ کر کہہ رہا ہوں، ان کی تصانیف مقدار کی حیثیت سے بھی کچھ کم نہیں اور تنوع کی حیثیت سے بھی کچھ کم نہیں اور پھر قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی کچھ کم نہیں۔ وہ اور مولانا عبدالباری ندویؒ دونوں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے پاس پہنچے، کوئی مدرسی اور گروہی عصبیت حائل نہیں ہوئی، کوئی شہرت کا جو بہت بڑا فتنہ ہے، شہرت یہ تھی کہ مستشرقین بھی مرعوب تھے اور ان کے سوالات کے جوابات ان سے مانگتے تھے علوم نے بھی ان کا لوہا مان لیا وہ تھانہ بھون گئے اور پھر اس طرح اپنے کو ڈال دیا کہ حضرت تھانویؒ کو یہ کہنا پڑا ؎

از سلیمان گیر اخلاص عمل
داں تو ندوی، مستعد از دغل

مجھے کم معلوم ہے کہ کسی شیخ نے اپنے ایک مسترشد کی ایسی مدح کی ہو جیسا کہ حضرت تھانویؒ نے مولانا سید سلیمان ندویؒ کی ہے اور ان کو اتنی جلدی خلافت دی کہ ان کے پرانے اصحاب کو تعجب ہوا اور بعض کو ملال بھی ہوا ہو گا۔ حضرت تھانویؒ کا جب وصال ہوا اس وقت حضرت مولانا ... اور سید صاحب بہیں مقیم تھے

کو اس کا اتنا رنج و ملال ہوا کہ بچوں کی طرح روتے تھے کہ گویا سایہ پدری اٹھ گیا۔

اسی طرح مولانا عبدالباری صاحب ہمارے لئے قابل تقلید مثال ہیں۔ مولانا عبدالباری ندویؒ اور مولانا عبدالماجد دریابادی دونوں گئے تو حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ آپ حضرات کو زیادہ مناسبت مولانا حسین احمد مدنی سے ہے، آپ ان سے بیعت ہو جائیں ویسے خدمت کو میں حاضر ہوں۔

جہاں تک مولانا عبدالباری صاحب کا تعلق ہے مجھے ذاتی طور پر معلوم ہے کہ حضرت تھانویؒ سے ان کا تعلق ایسا ہی تھا جیسے ایک ادنیٰ مرید کا ہوتا ہے، وہ ان کو اپنا حقیقی شیخ مانتے تھے پھر مولانا تھانویؒ نے کچھ عرصہ کے بعد اطاعت و انقیاد کا مادہ دیکھ کر ان کو اجازت دی۔

بھائیو! یہ دو سبق ہیں، یہ دو پہلو نہ صرف جاذب نظر مستحسن ہیں، مولانا عبدالباری کی زندگی سے یہ دو سبق لیں کہ، ایک تو کام کا پیدا کرنا ہے ڈگری والے تو وہ ہے تیار کے سپاہی اپنے کو محسوس کرتے ہیں چاہے وہ کسی یونیورسٹی میں صدر شعبہ ہو جائیں، یا وائس چانسلر بن جائیں۔ دوسرا سبق یہ لینے کا ہے بھائی سب کچھ کر لیجئے مگر جیسے کسی نے کہا ہے ؎

مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم
تا غلام شمس تبریزی نہ شد

اور ؎

قال را بگذار مرد حال شو

یہ حقیقت ہے، یہ آج سمجھ لو جب بھی خوش قسمت ہو، دو برس بعد سمجھ لو جب بھی خوش قسمت ہو، اور مرنے سے پہلے اس وقت سمجھو گے تب بھی اچھا ہے، لیکن کرنے کا وقت نکل چکا ہو گا۔ نہ محنت کر سکو گے نہ کہیں آ جا سکو گے۔

بھائیو! جیسے پہلے ہمارے عربی مدارس کا رواج تھا مجھے خوب تاریخ معلوم ہے عربی مدارس کی، کہ مولانا لطف اللہ رحمۃ اللہ کا حلقہ درس اس وقت وہ مرکز بنا ہوا تھا جہاں سے لے کر ایران، ترکستان تک کے ذہین و جید الاستعداد طالب علموں کا، حضرت مولانا لطف اللہؒ کے یہاں جو طالب علم پڑھتا تھا وہ گنج مراد آباد جا کر مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی سے روحانی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ یہاں دماغ کو روشن کرتا تھا تو وہاں دل کو روشن کرتا تھا۔ دیوبند میں جو طالب علم پڑھتا تھا تو وہ سیدھے گنگوہ چلا جاتا تھا، وہاں جا کر وہ تکمیل کرتا تھا۔ جب ان کا دور ختم ہوا تو وہ رائے پور جاتا تھا یا پھر تھانہ بھون جاتا تھا۔ مولانا عبدالحئیؒ کے درس میں جو لوگ شریک ہوتے تھے وہ سیدھے گنج مراد چلے جاتے تھے یہ عام بات تھی۔ میں دعوت پیری مریدی

کی نہیں دے رہا ہوں، حالانکہ پیری مریدی کوئی عیب نہیں ہے۔ جہاں کہتا ہوں ہرگز میرے نزدیک عیب نہیں ہے، اگر عیب ہوتا تو مولانا سید سلیمان ندویؒ، مولانا عبدالباری ندویؒ الحمد للہ سب روشن خیالوں میں سب سے زیادہ روشن خیال ہیں میں خود روشن خیال ہوں، روشن خیالوں نے جتنی دنیا دیکھی ہے ان سے زیادہ میں نے دنیا دیکھی ہے۔ میں اس کے بعد بھی پیری مریدی کا قائل ہوں، اور عامل بھی ہوں، میں شرماتا نہیں ہوں اور اپنے لئے مزدوری سمجھتا ہوں، اس کے باوجود بھی میں آپ کو پیری مریدی کی دعوت نہیں دے رہا ہوں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں دلالی کر رہا ہوں، میں کہتا ہوں کہ اپنی روحانی پیاس بجھانے کی فکر کرو، اپنے ایمان و یقین کو ناقص سمجھو اور اپنے کو کامل نہ سمجھو، اگر یہ خلا رہا تو سب سے بڑا خلا رہا ـــــــ قال ابو ملیکۃ ادرکت ثلاثین من اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم ما منہم احد الا کلہم یخاف النفاق علی نفسہ۔ امام بخاریؒ کی تعلیقات میں ہے، اس کی خوبی یہ تھی کہ جس نے ان کو چمکایا اور ان کی کتابوں کو مقبولیت بخشی، اور اللہ کے نزدیک جو ان کے درجے ہیں وہ اللہ ہی جانتا ہے انہوں نے اس خلا کو محسوس کیا، اور دو لوگ اپنے اپنے وقت پر گئے اور انہوں نے بالکل اس کی پرواہ نہیں کی، یہ علامہ سید سلیمان ندویؒ ہیں، اگر کسی یونیورسٹی میں پہونچ جاتیں تو اس کے لئے فخر کی بات۔ وہاں کے وائس چانسلر اور پروفیسر ملنے کے لئے آئیں، اگر یورپ جائیں تو وہاں کے مستشرقین آئیں استفادہ کے لئے، مولانا عبدالباری ندویؒ اگر سوچتے کہ میں فلسفے کے دریا میں تیرا ہوا ہوں اور میں مولوی اشرف علی تھانوی بہشتی زیور کے مصنف کے پاس جاؤں یہ نہیں ہو سکتا یہ سب فروعی باتیں ہیں کہ یہ کون ہے یہ کون ہے، اسکی کتنی کتابیں ہیں کتنے درجے کی کتابیں ہیں ہمیں اس سے کچھ مطلب نہیں ہمیں صرف مطلب ہے ہمارا کام نکلے اور ہم اس خطرے سے بچ جائیں جو درپیش ہے۔ لاکھوں کروڑوں برس کی زندگی وہاں صاف طور پر کہہ دیا گیا، الا من اتی اللہ بقلب سلیم، وہاں صرف سوغات چاہیے جو قلب سلیم لے کر آئے، قلب سلیم کی تلاش میں وہاں یہ

لوگ گئے۔

بس میرے بھائیو میں ختم کرتا ہوں۔ یہ دو چیزیں میں کوئی تلقین نہیں کرتا، میں پیری مریدی کی رہنمائی نہیں کرتا میں کسی چیز کی تبلیغ نہیں کرتا میں اس اجمال بنیادی ضرورت کا احساس دلاتا ہوں کہ ہم کو آپ سب کو زندگی کے ہر دور میں اپنی تکمیل کی ضرورت ہے اور روحانیت کی ضرورت ہے وہ روحانیت ہمارے اندر پیدا ہو جائے اس کے ہم تحقیر کے ایک ملا کے پاس چلے گئے اور ان کے مرید ہوئے، عالم بن جانے کے بعد کلمہ پڑھنے کے بعد۔ کیا قرآن و حدیث میں کوئی چیز کم ہے اور کیا قرآن و حدیث میں اصلاح نفس کے لئے کچھ کم ہدایات ہیں، آپ ان باتوں اور شبہوں میں نہ پڑیں، آپ یہاں جس طرح بھی اپنی اصلاح و تربیت کا جو بھی انتظام ہو جب بھی ہو سکے فراغت کے بعد اس کی طرف آپ توجہ کریں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اس کی توفیق دے۔ حضرت مولانا عبدالباری صاحبؒ کے درجات کو بلند فرمائے۔ بحیثیت عالم کے بھی اور اس درسگاہ کے فاضل کی حیثیت سے بھی اس پر ہم سالہا سال فخر کریں گے اور بحیثیت مسلمان کے بھی اس کا ہم پر حق ہے کہ ہم ان کے لئے دعائے مغفرت کریں اور ایصال ثواب کریں اپنے اپنے طور پر، ایک مرتبہ سورہ یٰسین ہی پڑھ کر ایصال ثواب کریں جب یہ تحفہ انکے پاس پہونچے گا کہ یہ ہماری درسگاہ کے طالب علموں کی طرف سے ہے بہر حال ان کو خوشی ہو گی ان چیزوں کی وہاں پر کچھ قدر ہو گی یا نہیں کیا پتہ بہر حال ان کو خوشی ہو گی۔ یہ سعادت کی بات ہے اور تعلق کی بات ہے۔

دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اور اس ہفتہ میں جانے والے سب مرحومین کی، اس مہینے میں جانے والے سب مرحومین کی اور اس سال اور اس صدی میں جانے والے سب مرحومین کی اور سابقین و اولین سب کی مغفرت فرمائے، ان سب کے درجے بلند فرمائے، ان کی سیئات سے درگزر فرمائے۔ اللہ تعالیٰ تمام مومنین و مومنات کی مغفرت فرمائے۔

ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلا للذین آمنوا ربنا انک غفور رحیم۔

پیامِ ندوۃ العلماء { از: محمد الحسنی (مدیر البعث الاسلامی۔ ندوۃ العلماء)
ندوۃ العلماء کے تخیل اور پیام اور عہد حاضر میں اس کی اہمیت اور ضرورت کو سمجھنے کے لئے
ایک مختصر اور مفید کتاب
ناشر: دفتر اجلاس ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ
ملنے کے پتے: مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء … مجلس تحقیقات و نشریات اسلام پوسٹ بکس ۱۱۹ لکھنؤ

اپنی کہانی ـــ اپنی زبانی

از: مولانا عبدالباری ندویؒ

میرے والدین: میرا خاندان یا گھرانا دنیا کے جاہ و مال سے کہنا چاہیے کہ بالکل فارغ البال تھا۔ البتہ جن والدین کے گھر میں میں پیدا ہوا وہ بحمد اللہ خصوصاً زمانہ کو دیکھتے ہوئے دین کی دولت سے مالا مال تھے۔ والد مرحوم تو شاید شیوخ وقت میں حضرت مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کے نہ صرف معمولی مرید تھے بلکہ اپنی کشش یا ادادہ ادنیٰ سے ادنیٰ خدمت اور سلوک کے سلسلہ میں مجاہدات شاقہ کی بدولت بڑے چہیتے مرید تھے۔ مگر اخفا و استتار طبیعت پر اس قدر غالب تھا کہ وفات کے بعد جب ان کے شیخ کے پوتے مولانا محمد اسلم صاحب گدی میرے پاس تعزیت کے لئے تشریف لائے تو فرمایا کہ آج ایک حکیم صاحب مرحوم کا راز ظاہر کرتا ہوں۔ دادا رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد جب میں نے ان کے مجازین کی فہرست دیکھی تو اس میں حکیم صاحب مرحوم کا نام بھی تھا، تب میں نے ان سے عرض کیا کہ حضرت آپ تو اپنے شیخ کے مجاز بھی ہیں خود میں نے مجازین کی فہرست میں آپ کا نام پڑھا۔ میرے شانہ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا کہ بس ایک درخواست ہے کہ اب کسی اور پر اس کو ظاہر نہ فرمائیں۔ ان کی زندگی بھر میں نے انکے اس حکم کا پورا خیال رکھا لیکن اب ان کی وفات کے بعد آج آپ سے ظاہر کر دینے ہی کا جی چاہا۔

خود میرا ذہن بھی کبھی اس طرف نہ گیا نہ ان کے کسی مرید وغیرہ کا علم ہوا۔ بس زیادہ سے زیادہ ایک صاحب سے یہ معلوم ہوا کہ ان کو کچھ ذکر وغیرہ کی تعلیم فرمادی تھی۔ اب والدہ مرحومہ کے دینی احساسات کا ایک ہی واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ میں پونہ کے دوران ملازمت میں سالانہ بڑی تعطیل میں گھر اس حال میں آیا تھا کہ نماز صرف فرض پڑھتا تھا سنتیں بالکل متروک تھیں۔ اب بالکل یاد نہیں کہ شامت کا باعث کیا تھا، تاہم غالباً چند دونفتے کے بعد ہی سنتیں بھی پڑھنے لگا۔ تب والدہ روتی ہوئی ایک دن تشریف لائیں اور فرمایا کہ یہ تم کو کیا ہو گیا تھا کہ تم نماز بھی پوری نہیں پڑھتے تھے میں رو رو کر دن رات کی نمازوں میں دعا کرتی رہی اور اب الحمد للہ یہ دیکھ کر کہ تم پوری نماز پڑھنے لگے ہو جان میں جان آئی۔ دین کی حد تک روز اول ہی سے ان کی برکات کی ابتدا بقول الاکبر کے عارف اکبر کے کہ "دین ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے پیدا" یہ نظر کہنا چاہیے کہ والدین کی بدولت دنیا میں قدم رکھنے سے پہلے ہی نصیب ہونا شروع ہو گئی، جب ولادت کا وقت قریب ہوا اپنے فرنگی محلی شیخ و مرشد کی خدمت میں حاضری پر عرض کیا کہ حضرت گھر میں ولادت ہونے والی ہے۔ شیخ نے فرمایا انشاء اللہ لڑکا ہو گا۔ پھر والد نے نام کے لئے عرض کیا تو فرمایا کہ خالق باری پوری کر لینا۔ اس طرح اس عبدالخالق زادہ کا نام عبدالباری ہو کر خالق باری پوری ہوئی، جب بسم اللہ کا وقت آیا تو والدہ مرحومہ جو خود بھی حضرت ممدوح ہی کی مرید تھیں مجھے لے کر خدمت میں حاضر ہوئیں، ساتھ کچھ مٹھائی بھی تھی جو مرشد کے سامنے رکھی اور مرشد نے مجھ کو اپنی گود میں بٹھا کر مٹھائی کی ایک ڈلی اپنے منہ میں ڈالی اور وہی آدھی کاٹ کر میرے منھ میں ڈال دی۔

پھر سترکہ میں ایک بزرگ ابن بزرگ کے مکتب ہی میں بٹھایا۔ جو خود والد کے استاد بھی رہ چکے تھے، اور سیرتاً و صورتاً ہر طرح ماشاء اللہ بزرگ ہی تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ والد مرحوم کو ہمیشہ مکتب کے زمانہ ہی سے اس کا اہتمام رہا کہ استاد صرف کتابی ہی نہ ہو بلکہ مرد صالح بھی ہو۔

ندوہ میں داخلہ: ٹھیک بالکل معلوم نہیں کہ والد مرحوم کا ذہن ندوہ میں مجھ کو داخل کرنے کی طرف کیسے گیا، اغلب یہ ہے کہ وطن کے قریب ایک نئے مدرسہ کا لکھنؤ جیسے شہر میں قیام اور اس کی تازہ تازہ شہرت ہی والد کے لئے ندوہ میں میرے داخلے کے محرک ہوئی ہو گی۔ ساتھ ہی بالکل ممکن ہے کہ بہت کچھ دخل حضرت مولانا مونگیریؒ جیسے مسلم بزرگ کی نظامت اور حضرت مولانا سید عبدالحئیؒ کی نائب نظامت کو بھی رہا ہو۔ اس لئے کہ جس طرح میرا دادہیال پورا کا پورا حضرت فرنگی محلی کا مرید تھا اسی طرح نانہیال خصوصاً بڑے ماموں حضرت گنج مرادآبادیؒ سے بیعت تھے اور سال میں کم از کم ایک مرتبہ زندگی بھر حاضری دیتے رہے اور حضرت مولانا سید عبدالحئیؒ رائے بریلوی کے ساتھ والد مرحوم کا تعلق یہ سمجھ میں آتا ہے کہ مولانا مرحوم حضرت فرنگی محلیؒ کے شاگرد تھے اور والد مرحوم اپنے مرشد کی خدمت میں حاضری دیتے رہتے اور بار ہا ہفتوں قیام رہتا۔ اغلب ہے کہ اسی دوران میں مولانا مرحوم سے بھی والد مرحوم کا کچھ نہ کچھ تعلق و تعارف ہو گیا ہو اور ان کا نائب ناظم ہونا بھی میرے ندوہ بھیجے جانے کے محرکات میں رہا ہو باقی خود مجھ کو اچھی طرح یاد ہے جب پونا یا حیدرآباد وغیرہ سے لکھنؤ آتا تو حضرت نائب ناظم صاحب ممدوح کی خدمت میں بھی ضرور حاضر ہوتا۔ بڑی محبت و شفقت کا برتاؤ فرماتے اور بہت خصوصیت کے ساتھ پیش آتے۔ ادھر مولانا علی میاں سلمہٗ سے جب کبھی اس کا ذکر آیا تو انہوں نے بھی یہی فرمایا کہ ان کے والد مرحوم اور احقر کے والد مرحوم دونوں کا تعارف حضرت فرنگی محلی کے مرید و شاگرد ہونے ہی کی بنا پر رہا ہو گا۔ واللہ اعلم بالصواب۔

بہر حال اب ندوہ میں داخلہ ہو چکا تھا۔ جناب ناظم اور نائب ناظم رحمہم اللہ سے تو طلبا کا خاص تعلق براہ راست نہ تھا۔ جو کچھ تعلق تھا حضرات اساتذہ سے تھا یا جناب مہتمم صاحب دارالعلوم سے جو اس زمانہ میں مولانا حفیظ اللہ صاحب اعظم گڑھی تھے۔ ان سے بھی ایک خصوصیت یہ حاصل تھی کہ میرے بڑے چچا حکیم امجد علی مرحوم اور مہتمم صاحب موصوف حضرت مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے شاگرد تھے۔

ندوہ کا یہ زمانہ ابھی اپنے نصاب تعلیم و رنگ تعلیم وغیرہ کے اعتبار سے پرانے درس نظامی والے ہی مدارس کا سا تھا، مجھ کو خود کافیہ و شرح جامی اور مقامات حریری وغیرہ تک پڑھنا پڑا تھا جہاں تک یاد ہے کہ درس نظامی میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی، نظم و ضبط کا حال بھی کچھ اچھا نہ تھا، طلبا آزاد تھے، دن اور کبھی رات کو بھی بلا اجازت نکل جاتے بڑی رغبت کا مشغلہ بنگال مٹھائی خرید کر کھانا ہوتا پھر کچھ گپ شپ کے بعد چاہے جاگ کر اپنے اپنے بستر پر واپس آ جاتے، نماز کی اس وقت پابندی وقت کی حاضری ہوتی، جس کی طرف سے چوک کی آواز سنائی نہ دیتی اس کے نام کے آگے غیر حاضری کا "غ" بنا دیا جاتا اور ان غیر حاضر طلبہ کے نام کا ایک پرچہ باورچی خانہ بھیج دیا جاتا غیر حاضری کی سزا یہ تھی کہ گوشت کا پیالہ بند کر دیا جاتا خالی دال کھانا پڑتی، بلکہ اس تاثر کا نام ہی پیالہ کی نماز ہو گیا تھا۔

بہر حال قیام و طعام کا نظام تو بہت برا نہ تھا، باقی عام طور پر طلبہ پڑھنے لکھنے کی ذوق و رغبت کا کوئی اثر شاذ و نادر ہی رہا ہو گا، کھیل کود کے عالم میں آج کل کے کرکٹ، فٹ بال کا نام نہ تھا، بس صرف کبڈی کھیل لیا کرتے تھے، درسی کتابوں اور امتحانی تیاریوں کے سوا غیر درسی کتابوں کا علمی ذوق نہ تھا، نہ کتب خانہ میں طلبہ ایک آدھ کے سوا دکھائی دیتے، خود اپنا حال یہ رہا کہ درسی اور کتابی امتحانوں سے اتنا بے پروا رہتا کہ امتحان میں اکثر فیل ہی رہتا البتہ رعایتاً ترقی مل جاتی، باقی وقت یار باشی یا امین آباد کی نذر ہو جاتا جس کی بدولت پانچ روپیہ جو مجھے جیب خرچ کے لئے ملتے وہ کیا کافی ہوتے نتیجہ یہ کہ باقی پانچ روپیہ جو کھانا کی فیس کے آتے وہ بھی فضول خرچی کی نذر ہو جاتے، بالآخر مدرسہ کی طرف سے مطالبات کا تقاضہ والد صاحب کے پاس جاتا۔ وہ بھجوا تو دیتے لیکن ان حرکتوں کی بدولت میرا ندوہ سے نام کٹ کے نگرام مولانا محمد ادریس کی خدمت میں بھیج دیا گیا، جن سے ایک تعلق یہ تھا کہ میرے بڑے چچا حکیم امجد علی مرحوم اور وہ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی کے شاگرد تھے اور بھی کچھ تعلقات دادا مرحوم کے زمانہ سے چلے آ رہے تھے، مولانا سبق تو مجھے روز پڑھاتے ایک فقہ کی کتاب زنجی اور ایک مشکوٰۃ شریف کا، باقی نیچے کی بعض کتابیں اپنے عزیز مولوی محفوظ الرحمٰن صاحب سے پڑھواتے مولانا ادریس صاحبؒ نرے عالم نہ تھے، بلکہ جوار کے بزرگوں میں ان کا شمار تھا۔ اور اس تباہ کار نوجوان کی بزرگانہ نظر اسی کیا اثر ثابت ہوئی کہ نہ صرف نماز با جماعت پنجگانہ کا انھیں کی مسجد میں پابند ہو گیا پڑھنے کا شوق بھی اتنا ہو گیا کہ ندوہ کے زمانہ تعلیم کی جتنی خامیاں تھیں سب اللہ تعالیٰ نے دور فرمادیں، ندوہ میں تو دو سطریں عربی کی صحیح عبارت تک نہ پڑھ سکتا تھا۔ ادب، تفسیر و حدیث کی کتابیں بے تکلف پڑھنے لگا تھا اور مطالعہ کی استعداد اچھی پیدا ہو گئی تھی۔

ندوہ میں دوبارہ داخلہ:

پھر ندوہ میں علامہ شبلیؒ مستقلاً تشریف لائے تو نہیں معلوم کیسے والد نے مجھ کو دوبارہ ندوہ بھجوا دیا، جس درجہ کو چھوڑ کر میں نگرام گیا تھا اسی درجہ میں دوبارہ داخلہ دینے پر ندوہ تو تیار تھا، میں نے خود ہی ایک درجہ نیچے نام لکھوایا تاکہ کتابوں کے ساتھ مل سکوں نگرام کے چند ماہ قیام سے میری تعلیمی حالت بہت سدھر گئی تھی۔ اب محنت کا یہ حال تھا کہ بجز نماز کی حاضری اور کھانے سونے وغیرہ کے اوقات کے کہنا چاہیے کہ پورا وقت کتابوں میں ہی گذرتا تھا۔ اور ایک ہی سال میں نہ صرف امتحان میں اول آیا بلکہ سارے پرچے ایسے اچھے رہے کہ مولانا حفیظ اللہ صاحب جس پرچہ کے ممتحن تھے بعض بغیر کوئی مشکل ہو گئی کہ یہ میرے جواب ہیں، فرمایا کہ یہ اس خطا کا ثمرہ ہے اتنی ترقی کر لی اور مجھ کو بلا کر بڑی شاباشی دی، پھر میرے بعد سے اپنے درجہ میں ممتاز محنتی اور شوقین طلبہ میں شمار ہوتا تھا۔

عہد شبلی کا اثر: عام طور پر ندوہ کے

طلبہ پر یہ ہوا کہ ان میں نہ صرف درسی کتابوں کے پڑھنے کا شوق ہوگیا بلکہ غیر درسی کتابوں کے پڑھنے کا بھی عام شوق پیدا ہوگیا۔ ساتھ ہی مضمون نگاری وغیرہ کا بھی، کتب خانہ جس میں پہلے شاذ و نادر ہی دو ایک طالب علم نظر آتے تھے اب قریب قریب بھرا رہتا، نیز مولانا کے اثر سے تاریخ و ادب کے مطالعہ، تحریر و تقریر کا شوق و ذوق عام ہوگیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک دلچسپ لطیفہ یاد آیا [illegible] کے ایک طالب علم عبدالعزیز نام کے تھے، ماشاءاللہ اب بھی موجود ہیں اور اپنے گھر پر کاشتکاری کا کام کرتے ہیں، انہوں نے کہاں سے ایک پرانی کرسی میز خرید کر اسی پر علامہ شبلی کی نقالی میں بیٹھ کر مضمون نگاری کیا کرتے، مگر جب مولانا کو اپنا کوئی مضمون دکھاتے تو مولانا فرماتے کہ تم اس کی کوشش نہ کرو، مضمون نگاری نہ فرض ہے نہ فرض ہے نہ تم کو اس سے مناسبت ہے آخر کار وہ مایوس ہو کر بیٹھ ہی گئے اور اب جاکر اندازہ ہوتا ہے کہ جس اعظم گڑھ کے مولانا عبدالسلام نے اپنی یادگاریں درجنوں کتابیں چھوڑیں اسی اعظم گڑھ کے میاں عبدالعزیز ایک مضمون بھی شاید زندگی بھر نہ لکھ سکے۔ اصل میں مولانا شبلیؒ میں جوہر شناسی کا ملکہ بہت غیر معمولی تھا۔ ان کے دارالعلوم میں قدم رکھتے ہی حضرت سید صاحبؒ کا تو ذکر ہی کیا مولوی عبدالسلام، مولوی ضیاء الحسن وغیرہ کئی طالب علم دیکھتے دیکھتے اچھے خاصے مضمون نگار ہو گئے جن میں سے بعض کے مضمون "الندوہ" میں شائع بھی ہوتے اور قدر کی نگاہ سے پڑھے جاتے۔

حضرت علامہؒ کی مجلس عام کا وقت عصر اور مغرب کے وقت رہتا، جس میں اس وقت کے بی اے کے فلسفے کے طالب علم اور آج کے مولانا عبدالماجد نیز ان کے بڑے بھائی ڈپٹی عبدالمجید مرحوم وغیرہ دوسرے لوگ بھی آ بیٹھتے۔ ندوہ کے طلبہ کے ساتھ حضرت ممدوح کا معاملہ بالکل اولاد کا سا تھا، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اولاد سے بھی بڑھ کر، ایک لطیفہ یاد آ گیا غالباً مجلس ہی میں کسی نے یہ خبر سنائی کہ میاں حامد (مولانا کے اکلوتے صاحبزادے) نے فٹ بال میں کوئی کپ یا انعام واصل کیا ہے، مولانا نے برجستہ فرمایا کہ یہ تو شبلی کے لڑکے کی نہیں کسی ندوے کے لڑکے کی تعریف ہوتی، اس سے اندازہ لگائیے کہ مولانا اپنی اولاد کس کو سمجھتے تھے، اور اس کے حق میں دعائیں دے سکنے کی کس قدر انتظار رکھتے۔ اس کی سب سے بڑی شہادت خود راقم بلکہ آپ بیتی ہے۔

علامہؒ ہی کے زمانہ سے مصر کے رسائل و اخبار آنے لگے تھے، ان میں ایک رسالہ "المقتطف" نام کا ہوتا جو کسی عیسائی کی زیر ادارت تھا، اس میں جدید فلسفہ اور سائنس کی بحثیں زیادہ ہوتیں مجھ کو یوں بھی منقولات کے بجائے معقولات سے زیادہ مناسبت

ساتھ ہی قدیم معقولات کی شروح در شروح، حواشی در حواشی کے قیل و قال سے الجھن بھی بہت ہوتی، خدا بھلا کرے علامہ ممدوح کا کہ انہوں نے اپنے زمانے میں نصاب میں جو تبدیلیاں کیں ان میں سے بعض ایسی بھی تھیں جنھوں نے میری دلچسپی قدیم معقولات سے بھی کچھ بڑھا دی مثلاً "شرح حکمۃ العین" "شرح حکمۃ الاشراق" جیسی کتابوں نے، بالخصوص "شرح حکمۃ الاشراق" پڑھانے والے استاد مولانا نذیر علی حیدرآبادی تھے، جنھوں نے اپنے خاص طرز تعلیم سے میری رغبت اور بڑھا دی، اچھے اور لائق اساتذہ کے لانے میں حضرت علامہ کوئی کسر اٹھا نہ رکھتے، کہاں کہاں سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر استاد لاتے تھے، خود اپنے استاد مولانا فاروق چریاکوٹی کو بھی دوبارہ بلایا تھا۔ یہ دونوں حضرات مولانا نذیر علی اور مولانا چریاکوٹی حقیقت میں پرانے قسم کے اساتذہ کی جیتی جاگتی مثال تھے، لیٹے بیٹھتے جاگتے اپنے طلبہ اور ان کو پڑھائی جانے والی کتابوں کے متعلق ہی مطالعہ و فکر میں رہتے اس کی ایک مثال مولانا نذیر علی کی یاد آئی جو شرح حکمۃ الاشراق اور اقلیدس پڑھاتے تھے۔ ایک دن حوائج ضروریہ کے لئے میں کچھ رات گئے نا وقت اٹھ بیٹھا اور وہ حوض جس میں پانی بھرا رہتا اور ٹونٹیاں لگی رہتی تھیں مولانا کی قیام گاہ کے قریب ہی تھا، فراغت کرکے جب مولانا کے قریب سے گذرا تو مولانا کو کچھ چاپ ملی، فرمایا کون ہے؟ عرض کیا عبدالباری! فوراً اپنے پاس بلایا اور بٹھا کر فرمایا کہ آج کے سبق میں شرح حکمۃ الاشراق کی جو بحث پڑھائی گئی تھی اس میں تمہیں کچھ اشکال تھا، اس کے بارہ میں سوچ رہا تھا، آؤ تمہارے سامنے پھر تقریر کئے دیتا ہوں تاکہ اشکال رفع ہو جائے۔

مذکورہ بالا مصری رسالہ "المقتطف" کو میں قریب قریب پورا پڑھ ڈالتا تھا، اس سے میرے اندر انگریزی پڑھنے کا شوق پیدا ہوا کہ کاش ان باتوں کو براہ راست انگریزی میں پڑھ سکتا۔ لیکن پڑھتا کیسے جب کہ والد مرحوم اس کے قریب جانا بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ گو دارالعلوم میں انگریزی پڑھانے کے استاد جو ماسٹر کے بجائے دارالعلوم کے بہت سے مولویوں سے زیادہ مولوی معلوم ہوتے تھے، چہرہ پر بڑی سی داڑھی، سر پر بڑا سا عمامہ، انگریزی پڑھنے کی لالچ میں ہر امر کر ان کے پاس جا بیٹھتا، پڑا مگر اور ایک رہبر شاید انہیں سے ختم بھی کر لی تھی، پھر اس کے بعد علامہ کے دور میں ایک کے بجائے دو انگریزی ماسٹر ہو گئے بلکہ تین، ایک جو حساب وغیرہ سکھاتے تھے عربی کے نصاب میں بھی خاصی تبدیلیاں ہو گئی تھیں، کچھ کتابیں جو اس وقت خود مجھے پڑھانی پڑیں ان میں شرح حکمۃ العین و شرح حکمۃ الاشراق کے علاوہ "دلائل الاعجاز" بھی تھی، قرآن مجید سے تعلق

ہونے کی بنا پر اس کتاب کو بھی دلچسپی سے پڑھا تھا، اور شاید اسی زمانہ سے قرآن مجید سے کچھ مناسبت پیدا ہوئی۔

بہرحال "المقتطف" پڑھتے پڑھتے اب میری سب سے بڑی آرزو یہی تھی کہ اتنی انگریزی پڑھ لوں کہ ان چیزوں کا مطالعہ خود انگریزی میں براہ راست کر سکوں، ٹھیک یاد نہیں ایک طرف تین تین اساتذہ تھے انگریزی کے بلکہ اس کا ایک مستقل شعبہ ہی الگ ہو گیا تھا جس کے ہیڈ ماسٹر قاضی تلمذ حسین صاحب گورکھپوری تھے، اس طرح اب خود ندوہ میں میرے انگریزی پڑھنے کی ایک صورت نکل آئی تھی، لیکن والد سے جب عرض کیا کہ میں ندوہ میں دو تین سال اب صرف انگریزی پڑھنا چاہتا ہوں تو بے ساختہ فرمایا کہ "میرے ذمہ کا جو کام تھا اللہ تعالیٰ نے وہ ندوہ کے نام میں پورا فرما دیا باقی اس انگریزی تعلیم کے کار خیر میں شرکت سے معذور ہوں" اس کے بعد سے خرچ دینا بند کر دیا۔ میں یہ فریاد لے کر حضرت علامہ کی خدمت میں پہونچا، بڑی تسلی فرمائی اور فرمایا گھبراؤ نہیں، انگریزی تعلیم کا انتظام ندوہ ہی سے ہو جائے گا، چنانچہ قاضی تلمذ حسین صاحب، ہیڈ ماسٹر اور دین محمد صاحب ماسٹر کو باقاعدہ طور پر ایک ایک سبق پڑھانے کا حکم دیدیا اور کھانے وغیرہ کا انتظام بھی ندوہ ہی سے فرما دیا۔ اس طرح پوری بے فکری سے صرف انگریزی پڑھنے میں مصروف ہو گیا، اور الحمدللہ کوئی دو برس کے بعد ہی اس قابل ہو گیا کہ انگریزی کی فلسفہ کی آسان کتابوں سے لغت کی مدد سے بقدر ضرورت مطلب نکال لینے لگا، دوسری طرف مدد کی ایک صورت یہ نکل آئی کہ آج کے ہمارے مفسر دریابادی اور زمانہ کے ماجد میاں جو لکھنؤ کیننگ کالج میں بی۔ اے کے فلسفہ کے طالب علم تھے ان سے بے تکلفانہ اور دوستانہ تعلقات بڑھنا شروع ہوئے اور غالباً نفسیات کی ایک کتاب ان سے بھی باقاعدہ پڑھنے لگا، نیز ان کی بدولت بعض ان کے رفقائے کالج ایسے مل گئے جو مجھے انگریزی پڑھنے پڑھانے میں اچھی خاصی مدد دیتے رہتے تھے، افسوس کہ وہ سب مرحوم ہو چکے، الغرض ندوہ کے دو مستقل استادوں اور بیرونی دوستوں خصوصاً ماجد میاں کی مدد سے اس قابل ہو گیا کہ فلسفہ کی اوسط درجہ تک کی کتابیں لغت کی مدد سے حسب ضرورت سمجھ لیتا تھا۔ خیال آیا کہ اگر مجھ کو اب کسی کالج میں سال دو برس فلسفہ کے لکچروں کی صرف سماعت کی اجازت مل جائے تو پھر ان شاء اللہ کسی ضابطہ کے امتحان کی ضرورت کا محتاج نہ رہونگا یہ خیال بھی حضرت استاذ علامہ کی خدمت میں پیش کیا۔ ممدوح نے علی گڑھ کے لئے تین خط لکھ کر دئے۔ ایک صاحبزادہ آفتاب احمد کے نام جن میں یہ تھا کہ حامل ہذا کے لئے ایجوکیشنل کانفرنس

کی طرف سے وظیفہ مقرر کر دیا جائے، موصوف نے پوچھا کہ کیا چاہتے ہو۔ عرض کیا پندرہ روپے ماہوار، انہوں نے اسی وقت اپنے دفتر سے باقاعدہ حکم لکھوا کر اور پندرہ روپیہ کی پہلی قسط دلوا بھی دی اور فرمایا کہ اب جہاں بھی رہو اپنے پتے سے دفتر کو مطلع رکھو، انشاء اللہ ماہ بماہ وظیفہ تم کو پہونچتا رہے گا۔ دوسرا خط حضرت علامہ نے اپنے بھتیجے اقبال کو لکھا تھا جو اس وقت علی گڑھ میں وکالت کرتے تھے کہ حامل ہذا ندوہ کے طالب علم ہیں علی گڑھ میں فلسفہ کے لکچر سننے کے لئے آرہے ہیں امید ہے کہ ان کے قیام کا انتظام اپنے ساتھ کر دوگے موصوف نے فرمایا اپنا گھر سمجھ کر بے تکلف آجائیے۔ تیسرا خط نواب وقار الملک کے نام تھا کہ حامل ہذا ندوہ کے فارغ التحصیل طالب علم ہیں، بعد کو ان کو جدید فلسفہ پڑھنے کا شوق ہوا تو اس کے لئے نجی طور پر انگریزی اتنی پڑھ لی ہے کہ فلسفہ کی معمولی کتابیں مطالعہ کے ذریعہ سمجھ لیتے ہیں، اب چاہتے یہ ہیں کہ کم از کم ایک سال ان کو فلسفہ کے لکچروں میں شرکت کی اجازت مل جائے۔ نواب صاحب نے اس خط کو پڑھ کر مولانا کا لحاظ تو اتنا فرمایا کہ جب میں ان کی خدمت سے واپس لوٹا تو دروازہ تک پہونچانے آئے لیکن آدمی وہ قانون و ضابطہ کے مشہور ہی تھے فرمایا کہ اس کا تعلق براہ راست پرنسپل سے ہے، میں مشورہ کے بعد جواب دوں گا، دوبارہ جب حاضر ہوا تو فرمایا کہ پرنسپل نے مجھ سے خود ایسا سوال کیا جس کا جواب نہیں بن پڑا کہ اگر اس طرح صرف لکچروں کے سننے کا دروازہ کھول دیا گیا تو پھر بند کس طرح کیا جائے گا، اور کالج کا نظام درہم برہم ہو جائے گا، غالباً ایسا ہی جواب مولانا شبلی کے خط کا بھی تحریر فرمایا ہمارے ماجد میاں اس زمانہ میں وہاں فلسفہ کے ایم۔ اے میں زیر تعلیم تھے۔ لکھنؤ کے تعلقات کی وجہ سے انہیں کا مہمان رہ کر بالآخر بے نیل مرام واپس آگیا۔

علی گڑھ سے بے نیل مرام واپس آنے کے بعد اب ایک ہی راستہ سمجھ میں آیا کہ انٹرنس کا امتحان پرائیویٹ دینا چاہئے لیکن پرائیویٹ کے لئے قید تھی کہ کسی ہائی اسکول میں کم از کم ایک سال ملازمت کی ہو۔ اس مشکل کے لئے بھی حضرت استاد کی خدمت میں عرض کیا، حسن اتفاق سے اس زمانہ میں فیض آباد کے ڈویژن کے انسپکٹر آف اسکولس عبدالعزیز صاحب تھے جو علی گڑھ میں حضرت استاد کے شاگرد رہ چکے تھے۔ استاد مرحوم نے حسب سابق میرے عرض کرتے ہی ایک سفارشی نامہ موصوف کے نام لکھ دیا، میں اس کو لے کر فیض آباد پہونچا، انسپکٹر صاحب موصوف نے جیسے ہی مولانا کا خط پڑھا مجھ کو کچھ جواب دئے بغیر دفتر سے ایک حکم نامہ لکھوا دیا کہ ہیڈ مولوی کی جو جگہ سلطان پور ہائی اسکول

میں خالی ہے حامل ہذا مولوی عبدالباری کا تقرر کیا جاتا ہے، اس طرح سلطان پور ہائی اسکول پہونچا اور وہاں اپنے رفیق اساتذہ کی مدد سے انگریزی اور دیگر مضامین کی تیاری میں لگ گیا۔

حضرت استاذ علامہ اس دوران میں ندوہ سے بالکل علیحدہ ہو کر اپنے وطن اعظم گڑھ جا کر اپنے بنگلا اور باغ میں عزلت نشین ہو چکے تھے، ایک طرف اس بنگلا اور باغ کو وقف فرما کر دارالمصنفین کے قیام کی تجویزیں لگے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ہر قسم کی تصنیف و تالیف سے قطع نظر فرما کر صرف سیرۃ النبیؐ میں مشغول تھے، احقر کا جی چاہا کہ ایسے عمر بھر کے محسن و محترم استاد کی خدمت میں دو چار دن کے لئے اعظم گڑھ جا کر حاضر ہوں، اعظم گڑھ پہونچا اور کم از کم تین دن سراپا شفقت استاد ہی کا مہمان رہا، اور کم و بیش حضرت کے آرام اور تصنیف کے کام کے علاوہ قریب ہی حاضر رہتا گفتگو دو ہی چیزوں پر فرماتے۔ دارالمصنفین کے قیام اور سیرۃ النبیؐ کی تکمیل، ان دو کے سوا تیسری بات مشکل ہی سے فرماتے، بس اس طرح مولانا کو اپنے خاتمہ ہی کی فکر معلوم ہوتی تھی جس کے لئے اب شفیع المذنبین کی سیرت ہی کی تکمیل ہو رہی تھی جیسا کہ خود فرماتے ہیں ؎

عجم کی مدح کی، عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

تین دن رات کی حاضری میں استاد ممدوح کا معاملہ استاد سے زیادہ ایک شفیق باپ کا سا رہا، باتیں ایسی بے تکلفی اور محبت سے فرماتے جیسے کسی معمولی طالب علم سے نہیں بلکہ کسی بے تکلف دوست سے ہو رہی ہوں ندوہ کے زمانہ میں جب لکھنؤ سے باہر ہوتے مثلاً بمبئی میں اور میں اپنی انگریزی تعلیم کی تکمیل کے سلسلہ میں کلکتہ تو بڑی ہمت افزائی فرماتے، ایک کارڈ میں تحریر فرمایا کہ ؎

ہمت بلند دار کہ عزیز جہاں شوی

بہت سے والا ناموں میں اس طرح کی ہمت افزائی اور مدد فرمائی کی باتیں ہوتیں، کسی خط میں تحریر فرمایا کہ بس تم بقدر ضرورت انگریزی اور جدید فلسفہ سے مناسبت پیدا کر لو تو میں تم کو آغا خاں سے ولایت کا وظیفہ دلادوں گا، اعظم گڑھ کی آخری زیارت میں یہ بھی محسوس کیا کہ محترم و مرحوم استاد کو ندوہ سے جدائی کا بہت قلق تھا، راقم الحروف کے نزدیک یوں تو اصل مسئلہ کا وقت آ چکا تھا لیکن ظاہری اسباب میں ایک سبب کم از کم ندوہ سے علیحدگی بھی رہی ہوگی اس لئے کہ جس وقت میں حاضر ہوا ہوں مولانا نزلہ میں بالکل نڈھال تھے مگر بہت سی ہمت گفتگو فرماتے اور چلتے پھرتے۔

ندوہ کے زمانہ تعلق میں بارہا ندوہ دارالعلوم میں تشریف لاکر ہر ہفتہ طلبہ کی مجلس میں تقریر فرماتے، ایک تقریر کی یاد آج بھی ذہن میں نقش کالحجر ہے۔ فرمایا کہ یورپ کا تو کوئی ماضی نہیں اس لئے وہ مستقبل کے اندھیروں میں جدھر چاہے ٹھوکریں کھاتا پھرے لیکن اسلام کا ماضی اتنا شاندار ہے کہ مسلمانوں کی ترقی آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنے میں ہے یہاں تک کہ ہٹتے ہٹتے خیر القرون عہد صحابہ بلکہ خود حضور صلعم کے عہد مبارک تک جا پہونچیں یہی ہماری ترقی کا اصل راز ہے، اس قسم کی تقریریں ندوہ کے طلبہ کے عام مجمع میں فرمایا کرتے بلکہ جن طلبہ میں اردو یا عربی تقریر کی کچھ صلاحیت دیکھتے ان کو تنہائی میں بلا کر اور کوئی موضوع دیکر اپنے سامنے تقریر کراتے، خود اس راقم کو باوجود معذرت کے کم از کم ایک مرتبہ اپنے سامنے ہی تقریر کا حکم دیا، ساتھیوں کی دیکھا دیکھی الٹی سیدھی جیسی بن پڑی استاد کے حکم کو بجا لایا، تقریر تو جیسی تھی میں ہی جانتا ہوں لیکن استاد کی شفقت نہ بھلائی جانے والی ہے فرمایا کہ تم میں صلاحیت ہے لیکن ذرا مشق بڑھانے کی ضرورت ہے جس سے خامیاں اور جھجک دور ہو جائے گی۔

دکن کالج پونہ

حضرت مولانا سید سلیمان صاحب اپنے استاد مرحوم کی وصیت و حکم کے مطابق دکن کالج کی فارسی کی لکچراری خیرباد فرما کر سیرۃ النبیؐ کی تکمیل اعظم گڑھ آ گئے اور انتظامی امور کے لئے ساتھ ہی ساتھ مولانا مسعود علی صاحب مرحوم بھی، اب اسی باغ اور بنگلہ میں دارالمصنفین کی داغ بیل پڑ گئی، اور اب ماشاءاللہ سنتا ہے کہ شاہ معین الدین صاحب کے دور میں عمارتی ترقی بھی خاصی ہو گئی ہے اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔

پونہ کے لئے سید صاحب ممدوح نے میری خواہش اور اپنی شفقت سے میرا نام اپنی جگہ کے لئے پروفیسر شیخ عبدالقادر کو پیش کر دیا جو شعبۂ فارسی کے صدر تھے، گو میرے مقابلہ میں فارسی کے کئی فرسٹ کلاس ایم۔ اے والوں کی بھی درخواستیں تھیں لیکن شیخ صاحب موصوف نے صدر شعبہ ہونے کی حیثیت سے اپنا پورا وزن ڈال کر سب کے مقابلہ میں میرا ہی انتخاب کرا لیا، پونہ پہونچنے پر شیخ صاحب نے یہی فرمایا کہ سید صاحب تو فارسی میں لکچر دیتے تھے لیکن اگر آپ انگریزی میں عادت ڈال لیں تو یہاں بہت مواقع آپ کے لئے نکلیں گے، میں نے ڈرتے ڈرتے دو شرطوں کے ساتھ قبول کر لیا، ایک تو یہ کہ مجھے سردست انٹر کلاس کے لئے لکچر دئے جائیں، کیونکہ انٹر والوں کی انگریزی اتنی اچھی نہ ہوگی کہ میری انگریزی پر زیادہ ہنس سکیں، اور دوسرا یہ کہ میں ابتداء خواجہ حافظ سے کروں گا جو اثر

کلاس میں داخل تھا، خواجہ حافظ سے مجھے استاد محترم علامہ کے مشورہ کے مطابق دلچسپی بھی زیادہ ہوگئی تھی، قریب قریب دیوان ہر وقت سرہانے پڑا رہتا، مزید برآں دیوان کے ترجمے اور شرحیں بھی انگریزی میں ملتی تھیں، بہرحال تیاری کرتا رہا، کالج کھلنے پر اللہ کا نام لے کر لکچر شروع کر دیا الحمدللہ کوئی خاص دشواری نہیں ہوئی، طلبہ پر بھی اثر اچھا ہی رہا، پھر کوئی دو برس بعد بی۔ اے کا بھی ایک لکچر لے لیا، الحمدللہ اس میں ہر طرح توقع سے بڑھ کر کامیابی، اور نیک نامی رہی، ایک دوست ڈپٹی باقر علی صاحب کو مجھ سے کچھ ایسی موافقت ہوگئی تھی کہ کچہری سے اٹھ کر وہ قریب قریب روز ہی میرے مکان پر آ جاتے اور مغرب تک رہتے، ایک دن بہت خوش خوش آئے اور کہا کہ خاص طور پر آپ کو مبارکباد دینے آیا ہوں، مبارکباد اس بات کی کہ آپ نے انگریزی کا تو ایک بھی امتحان پاس نہیں کیا، اس لئے میں ڈر رہا تھا کہ آپ بی۔ اے کو کیسے لکچر دیتے ہوں گے لیکن آج میں نے مسٹر منشی جی سے کہ سب سے ہوشیار طالب علم سے پوچھا تو انہوں نے بہت جوش اور اعتماد کے ساتھ کہا کہ اگر مولوی صاحب رہ گئے تو بھی پریسیڈنسی میں ان سے بہتر کوئی استاد نہ ہوگا باقی پروفیسر عبدالقادر مرحوم باوجود صدر شعبہ اور آئی۔ ای۔ ایس ہونے کے اس خاکسار کے ساتھ بڑی عنایت و محبت فرماتے یوں بھی اپنی ذات میں وہ شرافت و انسانیت کا مجسمہ تھے، اس کے لئے ایک ہی بات کافی ہوگی کہ صدر شعبہ ہونے کی حیثیت سے ان کو حق تھا کہ اپنے ماتحت اساتذہ کو جو چاہیں کام سپرد کریں لیکن راقم الحروف کے ساتھ معاملہ اس کے بالکل برعکس اس حد تک تھا کہ کالج جب کھلتا تو خود میرے پاس تشریف لاکر فرماتے کہ آپ مجھے کیا کام دیتے ہیں، میں جو دو ایک لکچر قبول کر لیتا باقی سب اپنے ذمہ رکھ لیتے اس سے بڑھ کر سنئے کہ مہینہ میں کسی اتوار کی چھٹی میں اپنے گھر کا سامان خریدنے بازار جاتے وقت میرے گھر پر بھی ہوتے جاتے اور فرماتے کہ کلو (میرے گھر کی ملازم) کو میرے ساتھ کر دیں تو آپ کے یہاں کی ضرورت کا سامان بھی ان کو خرید وا دوں، دو ایک مرتبہ تو میں نے اس کو قبول کر لیا باقی آئندہ کے لئے شرمندگی کو ساتھ جو ملا کر بھی جلونگا اور پھر یہی معمول رہا، وہاں اچھے اچھے کالج کے بڑے بڑے پروفیسر جو اکثر یکہ و یورپ کی ڈگریاں اور موٹر رکھتے تھے موٹروں ہی میں خود بازار سے بے تکلف اپنے اور گھر کی ضروریات کا سامان لاتے، اس سلسلہ میں مہاراشٹر والوں کا اپنی تہذیب اور طریقوں پر جس طرح اصرار دیکھا وہ خصوصاً ہم مسلمانوں کے لئے

سنانے کے لائق ہے، بڑے بڑے جلسوں میں شرکت کا اتفاق ہوا جس میں گورنر وغیرہ تک مدعو ہوتے لیکن کسی ایک پروفیسر کو بھی دیکھنا یاد نہیں جو اپنے اسی لباس میں نہ ہوتا جو گھر یا روزانہ کا معمول تھا یعنی سر پر ایک خاص پگڑی نما ٹوپی اور پاؤں میں لال جوتیاں، اس سلسلہ کی کچھ قابل ذکر باتیں اور بھی سنئے، میرے شاگردوں میں زیادہ تر مرہٹے اور پارسی اور چند حیدرآباد کے مسلمان تھے، دکن کالج کے سالانہ جلسے کے موقع پر معمول یہ تھا کہ ایک وقت مسلمان اپنے ہاسٹل میں اساتذہ کی دعوت کرتے اور دوسرے وقت غیر مسلمان طلبہ میں بالعموم مسلمان طلبہ کے یہاں شریک ہو جایا کرتا، ان کے ڈائننگ ہال میں چاروں طرف تصویریں لگی ہوتیں اور کھانے میں چھری کانٹوں کا استعمال ہوتا، مزید حیدرآباد کے طلبہ اپنی حیدرآبادی بریانی کا اضافہ کر دیتے جس کو غیر مسلم اساتذہ اور انگریز پروفیسر پرنسپل سب ہی پسند کرتے، ایک مرتبہ اسی سالانہ تقریب کے موقع پر میرے پرائیویٹ کمرہ میں دو چار طلبہ آئے اور کہا کہ آپ ہر سال مسلمانوں کے ڈنر میں شریک ہوتے ہیں، اس سال درخواست ہے کہ ہمارے ساتھ شریک ہوں، میں نے کہا کہ آپ نے پہلے بھی دعوت دی ہوتی تو ضرور شریک ہوتا زیادہ سے زیادہ ایک بار ان کے یہاں اور ایک بار آپ کے یہاں، اب سنئے ان کے یہاں کھانے کا وقت دیکھئے کیا تھا، میرے پرائیویٹ کمرہ میں ایک طالب علم اپنے کاندھے پر دھوتی ڈالے ہوئے اس انداز میں کھڑے ہوئے گویا کچھ کہنا چاہتے ہیں، میں نے کہا کہ جو کچھ کہنا ہو بے تکلف کہئے، تو بے تکلف نہایت شرم کے ساتھ کہا، وہاں سب لوگ دھوتی ہی میں ہوں گے، اگر آپ بھی پسند کریں تو دھوتی حاضر ہے، میں اس وقت اپنے کمرہ میں شیروانی اتارے کرتہ پائجامہ میں تھا، میں نے کہا کہ اگر ایسی ہی بے تکلفی ہے تو میں بلا شیروانی پہنے اسی بے تکلف لباس کرتے پائجامہ میں چلا چلوں۔ کہا بسر اللہ

دکن کالج کا جب ذکر آتا ہے تو وہاں کے پرنسپل ایف۔ ڈبلیو بین کی یاد آ جاتی ہے جو انگریزی کا مشہور مصنف بھی تھا۔ اس درمیان میں پروفیسر شیخ کا تبادلہ الفنسٹن کالج بمبئی ہو گیا تھا مجھے ان سے ملنے کے لئے بمبئی جانے کی ضرورت ہوئی، میں پرنسپل صاحب سے اجازت لینے کے لئے ان کے کمرہ میں گیا کہ دو روز کے لئے بمبئی جانا چاہتا ہوں، اس کا جواب موصوف نے مذاقاً نماز میں یہ دیا کہ پھر میں کیا کروں؟ میں نے عرض کیا کہ پھر میری اجازت لوں؟ اس کا جواب پرنسپل نے یہ دیا کہ میرے کالج میں ہر شخص کے متعلق سب سے پہلے یہ اطمینان کر لیتا ہوں کہ یہ اہلیت اور فرض شناسی کے ساتھ کام کر سکتے یا نہیں، جس کے متعلق اطمینان نہیں ہوتا اس کا میں اپنے کالج میں رہنا ہی پسند نہیں کرتا، آپ کو اگر کہیں

جانا ہے تو بے تکلف جائیے۔ اسی دوران بورڈ پر نوٹس لگوا دیجئے کہ فلاں دن میرا لکچر ہوگا تاکہ طلبہ پریشان نہ ہوں، یہ پرنسپل صاحب جن کو ظاہری ضابطہ پرستی سے کچھ بیزاری سی تھی اور شیخ شرافت نفس کی وجہ سے ان کالج میں راقم ہذا کو بہت ہی اطمینان اور سکون نصیب رہا۔ ان دونوں شخصیتوں کی بدولت لکھنے پڑھنے کا موقعہ بہت ملتا رہا، کالج کی لائبریری میں کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ تھا، پرنسپل صاحب کو خود بھی فلسفہ کا بڑا ذوق تھا، اس لئے اس فن کی کتابوں سے بھی لائبریری خاص طور پر معمور تھی، میں نے ان سے خوب فائدہ اٹھایا، جدید فلسفہ میں ڈی کارٹ سے لیکر ڈیوڈ ہیوم تک کی کتابوں کے خصوصیت سے پڑھنے کا موقعہ وہیں ملا، شروع میں اس موضوع پر جب کچھ لکھنے کا خیال آیا تو جی چاہا کہ فلسفہ کی کسی مختصر و مستند تاریخ ہی کا ترجمہ کر دیا جائے، چنانچہ جرمنی کے مشہور فلسفی ویبر کی تاریخ فلسفہ کے انگریزی ترجمہ کا ترجمہ شروع بھی کر دیا اور بہت سا کر بھی ڈالا، پھر خیال بدل گیا اور ارادہ یہ ہوا کہ اس کی بجائے براہ راست اردو میں انگریزی کی مختلف کتابوں کو سامنے رکھ کر ایک تاریخ فلسفہ مرتب ہو جائے، اس کام کا بھی بیشتر حصہ ہو گیا تھا، لیکن جدید فلسفہ میں مجھ کو ڈی کارٹ سے لے کر ہیوم تک اور ان میں بھی خصوصیت کے ساتھ برکلے کی کتاب سے زیادہ دلچسپی محسوس ہوئی اور اس کی ضرورت بھی محسوس ہوئی اس لئے اور سارے خیالات چھوڑ کر براہ راست برکلے کی کتاب "پرنسپلز آف ہیومن نالج" (PRINCIPLES OF HUMAN KNOWLEDGE) کا ترجمہ "مبادی علم انسانی" کے نام سے کر ڈالا، ساتھ ہی برکلے کی سوانح اور اس کے فلسفہ پر بھی ایک کتاب لکھ گئی، یہ دونوں کتابیں دار المصنفین اعظم گڈھ سے شائع ہوئیں۔

گجرات کالج احمد آباد:

پروفیسر شیخ کے بھی تبادلہ کے بعد اور پرنسپل جین کے وظیفہ پر مستقلاً علاحدہ ہو جانے کے بعد میرا تبادلہ گجرات کالج احمد آباد ہو گیا، گجرات کالج ہی کے دوران قیام میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس طے پایا، راقم ناکارہ کے بڑے مہربان و قدردان مولانا حبیب الرحمن خاں شیروانی کا حکم آیا کہ تم کو اس اجلاس میں اپنے پسند کے کسی موضوع پر تقریر کرنا ہے اور اس سلسلہ میں کوئی معذرت قبول نہ ہوگی، جواباً عرض کیا کہ اس حکم کے بعد معذرت کی گنجائش ہی کیا، البتہ اتنی درخواست ہے کہ مجھ کو چونکہ عام جلسوں میں تقریر کی عادت نہیں، البتہ امتثال امر کے لئے کچھ اپنے مذاق کی باتیں عرض کر دوں گا وقت عام اجلاس کی بجائے کسی مختصر اور محدود مجمع کا ہو تو بہتر ہوگا، اس کو قبول فرما کر رات کا وقت دیا گیا، میں نے ایک پرچہ یادداشت کے طور پر کچھ چیزیں لکھ لی تھیں، انہیں پر کم و بیش ایک گھنٹہ عرض کیا، جسے اس کو سب سے زیادہ خود صدر جلسہ سر ابراہیم رحمت اللہ (وزیر تعلیم بمبئی) نے پسند کیا اور بڑے اصرار سے فرمایا کہ اس کو آپ رسالہ کی صورت میں مرتب کر دیں تو میں اس کا انشاء اللہ انگریزی میں ترجمہ کرا دوں گا، بہرحال گجرات کالج کے تعلق سے یہی ایک کام ہو سکا کہ وہ تقریر "مذہب و عقلیات" کے نام سے مرتب ہو کر کانفرنس ہی کی طرف سے شائع بھی ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے اسے بڑھ چڑھ کر قبول بخشا حتی کہ ہمارے برادر گرامی قدر مولانا علی میاں سلمہم کو تو یہ مضمون اتنا پسند آیا کہ بعد نظر ثانی و تکملہ اس کا عربی میں ترجمہ کرنے پر تیار ہو گئے، لیکن نظر ثانی اور تکملہ کا معاملہ ایسا آسان نہ تھا، فلسفہ کے ساتھ یہ خیال دامن گیر ہو گیا کہ جدید ترین سائنسی نظریات و معلومات کو شریک کر کے اس کو ایک مستقل کتاب کی صورت دے دی جائے، علی میاں ممدوح کی طرف سے وقتاً فوقتاً یاد دہانی بھی جاری رہی، لیکن سائنس کا معاملہ راقم ہذا کے لئے فلسفہ کی طرح آسان نہ تھا، فلسفہ تو عمر بھر پڑھتا پڑھاتا رہا اور سائنس کے لئے پوری تیاری کی ضرورت تھی، جس میں کم و بیش تین چار سال لگ گئے اور درجنوں کتابیں پڑھنا پڑھیں، اب ذرا درمیان میں مولانا شیروانی رحمۃ اللہ علیہ قدردان اعظم کی عظیم قدردانی کا بھی ایک اور نمونہ ملاحظہ فرماتے چلیں۔

مجھ کو ابھی غالباً حیدرآباد عثمانیہ یونیورسٹی پہونچے چھ ماہ بھی پورے نہ ہوئے تھے کہ ایک دن کیا دیکھتا ہوں کہ دو سو روپیہ نقد الفہ کے ساتھ صدر الصدور مملکت آصفیہ کے دستخط سے ایک مراسلہ اس مضمون کا ملتا ہے کہ "مذہب و عقلیات" کے لکچر کے سلسلہ میں اور اس کے بعد جدید علم کلام پر جو ایک مستقل کتاب لکھنے کا ارادہ کیا تھا اس کی تکمیل کے لئے سردست دو سو روپیہ ماہوار دو سال کے لئے منظور کئے جاتے ہیں، امید ہے کہ کام شروع کر دیں گے، باقی اگر تکمیل کے لئے مزید توسیع درکار ہوئی تو اس کا بھی انتظام ہو جائیگا۔ یہ مراسلہ عین اس حال میں ملا کہ میں درد کے شدید دوروں سے بالکل فریش تھا اور خود شیروانی صاحب ممدوح اپنی بزرگانہ شفقت کی بنا پر ہر دوسرے دن عصر اور مغرب کے درمیان ضرورت عیادت سے مشرف فرماتے۔ مراسلہ کے جواب میں پہلی معذوری تو یہی ممدوح کی خدمت میں لکھا دی کہ ان دوروں کی بدولت میرے لئے یونیورسٹی کے دو لکچر روزانہ پورا کرنا بھی دشوار ہو رہا ہے اس لئے سردست مزید کسی خدمت کی طرف توجہ کرنے کا سوال ہی نہیں ہے، تاہم آنمخدوم کے حکم سے سرتابی بھی دشوار ہے اس لئے آنمخدوم کی دعاؤں سے اللہ تعالیٰ نے شفا بخشی تو انشاء اللہ امتثال امر کی حتی الوسع سعادت حاصل کروں گا، لیکن درد کی شدت اور دوروں کا سلسلہ جس طرح چل رہا تھا ان کی بدولت تو سال کا بیشتر حصہ بیماری کی رخصتوں میں گذر جاتا، کچھ حیدرآباد ہی میں اور کچھ لکھنؤ میں اسی دوران میں مولانا شیروانی کی شفقت اور قدردانی کا ایک اور لطیفہ سننے اور سنانے کا ہے۔ میں لکھنؤ بیماری کی رخصت پر آیا ہوا تھا، حیدرآباد میں میری ملازمت کے دو سال گذر جانے کے بعد حسب قاعدہ استقلال کی کارروائی پیش تھی یہاں جس کو گزیٹیڈ پوسٹ کہا جاتا ہے اس پر استقلال کے لئے وہاں خود اعلیٰ حضرت کی طرف سے منظوری عطا ہونا ضروری ہوتا، ابھی غالباً کارروائی اعلیٰ حضرت تک پہونچی بھی نہ تھی کہ ڈیوڑھی کے حاضر باش کسی مہربان نے اعلیٰ حضرت کے کانوں تک یہ بات پہونچا دی کہ شیروانی صاحب نے فلسفہ کا صدر ایسے شخص کو بنا دیا ہے جس کو فلسفہ کی کیا سرے سے کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ سند بھی حاصل نہیں، اعلیٰ حضرت نے شیروانی صاحب سے جواب طلب کر لیا، اب جو جواب شیروانی صاحب نے دیا اس کا لطف ملاحظہ ہو کہ انہوں نے اسی "مذہب و عقلیات" کے رسالہ کے ساتھ اپنا عریضہ منسلک کر کے یہ تحریر فرمایا کہ ان کی سند یہ ہے کہ فلسفہ نے ان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے جس کا اندازہ سرکار خود رسالہ ہذا کی چند سطروں کے ملاحظہ سے فرما سکتے ہیں، بہرحال اعلیٰ حضرت کی طرف سے اس جواب کے بعد استقلال کی کارروائی پر دستخط ہو گئے اور میرے پاس دوستوں وغیرہ کے مبارکباد کے تار آنے لگے، مگر مولانا ممدوح کی اس اعلیٰ ظرفی کی داد دیجئے کہ انہوں نے کسی اور کو کیا مولانا گیلانی تک اس کی کانوں کان خبر نہ ہونے دی جن کے متعلق وہ جانتے تھے کہ میرے ہم قیام و ہم طعام ہی نہیں بلکہ دونوں کی رفاقت حیدرآباد میں ضرب المثل تھی، شیروانی صاحب کی خدمت میں جب حاضری ہوتی تو دونوں کے ساتھ ہی ہوتی پھر بھی ان تک سے کوئی ذکر تک نہ فرمایا کہ اعلیٰ حضرت کی طرف سے کیا جواب طلب ہوا تھا اور میں نے کیا جواب دیا، بالآخر جب لکھنؤ سے رخصت ختم ہونے پر میں حیدرآباد واپس گیا اور ممدوح کی خدمت میں حاضری ہوئی تب بہت مختصر الفاظ میں یہ قصہ سنایا کہ تمہارے استقلال کے وقت اعلیٰ حضرت نے یہ جواب طلب فرمایا تھا اور میں نے یہ جواب دیا، پھر اس سلسلہ میں کچھ کام کئے بغیر دو سو روپیہ جو ماہ بماہ آتے رہے ان کی رسید پر دستخط کر کے وصول کرتا اور اپنے خرچ میں لائے بغیر جمع کرتا رہا۔ جب قدردان اعظم خود حیدرآباد سے وظیفہ یاب ہو کر ہندوستان واپس آ گئے اور اس کے بعد خود میرے وظیفہ پر علیحدگی کا وقت قریب آیا تو جو بیس ہی چوبیس سو روپیہ وصول کئے تھے خط کے ساتھ رجسٹرار یونیورسٹی کو واپس کر دئے کہ چونکہ ایک ماہ بھی یہ کام توجہ کے ساتھ نہیں کر سکا اس لئے کسی حق الخدمت کا بھی کسی طرح حقدار نہیں لہٰذا اس کی واپسی قبول ہو کر سرکاری خزانہ میں داخل کر کے مشکور فرمایا جائے۔

اس درمیان میں جب حضرت حکیم الامت علیہ الرحمۃ کی جوتیوں تک رسائی ہوئی تو یہ رسالہ ملاحظہ کیلئے ان کی خدمت میں بھیجا تھا، جواب حسب عادت ایجازی اور اعجازی یہ عطا ہوا کہ یہ مذہب کا آہنی قلعہ ہے، راقم عاجز کو جتنی مسرت حضرت تھانوی کے ان دو لفظوں سے ہوئی شاید ہی کسی کی طویل سے طویل تنقید و تبصرہ سے ہوئی ہو۔

اب اولاً و آخراً ہمارے حضرت علی میاں سلمہم کی قدردانی و قدر افزائی ان کی کتاب "محسن کتابیں" کے آخر میں ملاحظہ ہو:۔

"مطالعہ کے سلسلہ میں مولانا عبد الباری صاحب ندوی کی ایک چھوٹی سی کتاب "مذہب و عقلیات" پر نظر پڑی جس کو ذوق و ذہن نے پورے طور پر اپنا لیا۔ اس رسالہ سے عقل و نقل کے حدود اور تجربہ و علم انسانی کی نارسی و ناپائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل ہوا جو مطالعہ میں بہت کام آیا اس کے بعد قدیم و جدید فلسفہ اور اس کی تاریخ پر جو کچھ ہاتھ آیا پڑھا مگر اس ابتدائی تخیل میں ذرا تزلزل واقع نہیں ہوا، بلکہ جس قدر پڑھا "ان ھم الا یخرصون" اور "کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ ولما یاتھم تاویلہ" کی تفسیر و توضیح ہوتی رہی۔

(محسن کتابیں صفحہ ۱۸۱)

حضرت حکیم الامت علیہ الرحمۃ کے "مذہبی آہنی قلعہ" کی اس سے بڑھ کر اور کیا شرح ہو سکتی جو حضرت علی میاں کے قلم نے فرمائی، اسی سلسلہ میں حضرت علی میاں ممدوح کی طلب علم کی راہ میں تواضع کی ایک انتہائی کرامت بھی سننے سنانے کی یاد آ گئی۔ "مذہب و عقلیات" کے جس چند ورقہ رسالہ کی ممدوح نے اتنی تحسین فرمائی، اس کے دوران تحریر ہی میں ایک طرف مجھ پر عقلیت خصوصاً اس کی مادیت اور ارتقاء کے نظریات سے مبنیہ عقلی کا اثر پڑا تھا، دوسری طرف اسی راہ سے قرآن مجید سے کچھ مناسبت محسوس ہونے لگی تھی۔

جب سال کی بڑی تعطیلات میں لکھنؤ آتا تو ندوہ کے اوپر کے درجوں کے کچھ طلبہ قریب کی مسجد میں آ جاتے اور ان سے اپنی بھڑاس نکالتا رہتا ان میں کبھی کبھی علی میاں بھی آ بیٹھتے بلکہ غالباً حیدرآباد کے زمانہ تعلق میں کسی سال کی بڑی تعطیل میں آیا ہوا تھا تو غالباً کئی ہفتہ اپنے بعض اعزہ و احباب کے ساتھ روزانہ ہی کم و بیش دو میل کی مسافت طے فرما کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے لئے تشریف لاتے،

(بقیہ صفحہ ۱۲ پر)

محترمہ امۃ اللہ تسنیم صاحبہ

(مولانا محمد رابع ندوی)

ستودہ صفات شخصیت:

امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کی متوازن ستودہ صفات شخصیت نے خاندان کے تمام افراد نیز دیگر اہل تعلق میں ایک محبوبیت حاصل کر لی تھی۔ ان سے مل کر مسرت اور انس محسوس کیا جاتا تھا اور ان کی محبت و تربیت سے سیرت کی تعمیر ہوتی تھی۔ تکیہ شاہ علم اللہؒ میں تقریباً ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئیں۔ اور نشو و نما علمی و دینی ماحول میں ہوا۔ والد مولانا حکیم سید عبد الحی حسنی سابق ناظم ندوۃ العلماء اور بڑے بھائی مولانا ڈاکٹر سید عبد العلی حسنی صاحب کی شفقت و سرپرستی میں تربیت ہوئی۔ اسی کے ساتھ ساتھ اپنی عالی صفات والدہ کی تربیت و محبت سے پوری طرح مستفید ہوئیں۔ اسی ماحول میں ان کا علمی شوق پروان چڑھا اور دینی ذوق کی نمو ہوئی اور وہ ایک مربیہ اور عالمہ کی حیثیت سے خاندان میں نمایاں ہوئیں۔

ادبی ذوق:

شادی اپنے ماموں زاد بھائی مولانا سید ابو الخیر صاحب حسنی مرحوم سے ہوئی جو ایک عالم اور ادیب تھے۔ امۃ اللہ صاحبہ کا یہ دور جو خاوند کی رفاقت میں گذرا علمی لحاظ سے مضمون نگاری اور ادبی اشتغال کا دور تھا انہوں نے اس زمانہ میں بکثرت مضامین لکھے جو عام طور سے مسلم خواتین کے لئے اصلاحی و دینی موضوعات پر ہوا کرتے تھے۔ یہ مضامین اکثر و بیشتر رسالہ مسلم جالندھر میں شائع ہوا کرتے تھے۔ تقسیم ہند کے بعد جب یہ رسالہ پاکستان منتقل ہو گیا تو موصوفہ کا تعلق بھی اس رسالہ سے باقی نہیں رہا لیکن جلد ہی ان کے بھانجے مولانا محمد ثانی حسنی نے مسلم خواتین کے لئے ایک رسالہ اپنی اور موصوفہ کی ادارت میں نکالنا شروع کیا جو الحمد للہ تاحال جاری ہے یہ رسالہ ان کے تحریری و ادبی ذوق کی تسکین کا باعث بنا۔ شروع شروع میں وہ اس سے خاص علمی دلچسپی لیتی تھیں لیکن جیسے جیسے نگاہ کمزور ہوتی گئی یہ دلچسپی محدود ہوتی گئی البتہ مضامین کی صورت میں ان کا تعلق اس رسالہ سے برابر جاری رہا۔ مضامین کے ساتھ ساتھ نظموں اور مناجاتوں کا بھی سلسلہ رہا جو کتابچوں کی شکل میں علیحدہ سے شائع ہوئیں۔

ریاض الصالحین کا ترجمہ:

امۃ اللہ تسنیم صاحبہ نے جن کو خاندان کے اکثر بڑے چھوٹے "عائشہ بی بی" کے نام سے موسوم کرتے تھے اپنی عمر کے آخری تیس سال اپنے بھائیوں کے ساتھ گذارے۔ اسی زمانہ میں ان کو اپنے برادر خورد مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی کے ہمراہ ۱۹۶۳ء میں حج و زیارت کی بھی سعادت حاصل ہوئی جس میں ان کے ساتھ ان کی والدہ صاحبہ اور بھانجے مولانا محمد ثانی بھی تھے۔ اس حج و زیارت کا تذکرہ انہوں نے ہمیشہ لطف لے کر کیا دوران حج میں متعدد مناجاتیں اور نعتیں بھی کہیں۔ جن میں ان کے دل کی تڑپ اور دینی جذبہ صاف جھلکتا ہے۔ امۃ اللہ صاحبہ کا یہ تیس سالہ دور علمی اور تعلیمی مشغولیت میں گزرا۔ خاندان کے اس دور کی نئی خاتون نسل ان کی شاگرد ہے۔ انہوں نے اپنی ابتدائی عمر میں خود اپنی ذاتی دلچسپی سے عربی پڑھی تھی۔ وہ اپنے بھائیوں اور چچا مولانا سید طلحہ حسنی صاحب مرحوم سے جب اور جس قدر وقت ملتا تعلیم و استفادہ کرتی رہیں۔ اس کے نتیجہ میں ان کی عربی اتنی ہو گئی تھی کہ انہوں نے کئی عربی کتابوں کے ترجمے کئے۔ اور خاندان کی متعدد بچیوں کو ابتدائی عربی کی تعلیم دی۔ ان کے ترجموں میں اہم ترین ترجمہ احادیث کے مشہور مجموعہ "ریاض الصالحین" کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں احادیث کا انتخاب تربیت اخلاق و تعمیر سیرت کے موضوع تک محدود رکھا گیا ہے۔ یہ انتخاب مشہور محدث و شارح مسلم امام نووی نے کیا ہے۔ امۃ اللہ نے اس کتاب کا ترجمہ دو جلدوں میں کیا جس کا نام "زاد سفر" رکھا جو مکتبہ اسلام سے کئی بار طبع ہو کر مقبول ہوئی۔ رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ نے بھی اس کے معتدبہ نسخے خرید کر تقسیم کرائے۔ سعودی ریڈیو نے اپنی اردو سروس سے اس کتاب کی مترجم احادیث بالاقساط نشر کیں۔ مرحومہ اپنے اس تصنیفی کام کو آخرت کے لئے بڑا سرمایہ سمجھتی رہیں۔ امید ہے کہ یہ ان کے لئے عرصہ دراز تک صدقہ جاریہ ثابت ہوگا۔ مرحومہ نے اس کتاب کے ترجمہ میں بڑی محنت و دلسوزی سے کام لیا کیونکہ نہ صرف یہ کہ معیاری عربی کا سوال تھا جس کے لئے ماہرانہ علمی قابلیت کی ضرورت تھی بلکہ معاملہ حدیث شریف کا تھا جس میں بڑی امانت و مدد کی ضرورت تھی چنانچہ انہوں نے اپنا یہ ترجمہ اولاً اپنے فاضل بھائیوں کو دکھایا اور پھر دار العلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث مولانا شاہ محمد حلیم عطا صاحب کے پاس بھیج کر لفظ لفظ سنوایا۔ دونوں حیثیتوں سے تصدیق ہونے کے بعد مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ سے اس کے لئے مقدمہ حاصل کیا جس سے ترجمہ کی اہمیت کی تصدیق ہوتی ہے۔

علمی و تحریری سرمایہ:

مرحومہ کے دیگر مطبوعہ تصنیفی کاموں میں بچوں کے لئے قصص الانبیاء، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نیز صحابیات کے حالات پر بچیوں کے لئے متعدد کتابیں ہیں۔

مرحومہ نے جو زمانہ اپنی درمیانی عمر میں علمی و تحریری ذوق و دلچسپی میں گذارا اس میں بھی ان کے عالی ذوق کا خاصہ ثبوت ملتا ہے۔ انہوں نے اس دور میں مضامین لکھے نظمیں کہیں۔ انہوں نے بیت بازی کے نام سے ایک کتاب لکھی اس کتاب میں انہوں نے مستند اساتذہ شعراء اردو کے کلام سے ایک انتخاب تیار کیا جو چند بیت بازی کرنے والی خواتین کی زبان سے ایک ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہ بیت بازی بیک وقت افسانوی لطف کی بھی حامل ہے اور تربیت ذوق شعری کا ایک اچھا ذریعہ بھی ہے۔ اسی طرح "انجام بخیر" کے نام سے انہوں نے رسالہ مسلم میں بالاقساط ایک سلسلہ لکھا جو بیک وقت ادبی چاشنی بھی رکھتا ہے اور اصلاحی اہمیت بھی ان کا ایک دوسرا سلسلہ "میری بے زبان استانیاں" کے نام سے بالاقساط اسی رسالہ میں شائع ہوا جس سے ان کتابوں پر روشنی پڑتی ہے جن سے مرحومہ نے فائدہ اٹھایا اور انکی علمی زندگی کی نمو میں ان کا بڑا حصہ ہے۔ یہ غیر مطبوعہ مجموعے نیز مختلف پرچوں میں مرحومہ کے شائع شدہ مضامین نوجوان خواتین کی علمی و اخلاقی تربیت کا اچھا سامان رکھتے ہیں۔

جذبہ خدمت:

اپنی والدہ کے ضعف کے زمانہ میں چونکہ مرحومہ ان کے ساتھ رہیں اس لئے ان کو اپنی والدہ کی خدمت کا بیش بہا موقع حاصل ہوا۔ اور اس موقع سے انہوں نے بہت فائدہ اٹھایا۔ وہ اپنی والدہ کے لئے ہر وقت تیار رہتیں۔ ان کی ضروریات کا خیال رکھتیں، استنجے اور وضو میں مدد کرتیں۔ رات کو قریب ہی رہتیں جب اور جو ضرورت ہوتی مدد کرتیں۔ دونوں کی بھی جدائی ان میں ناقابل تحمل سمجھی جاتی۔ چنانچہ اپنی والدہ کی وفات کے بعد انہوں نے ایک خلا محسوس کیا۔ لیکن وہ خاندان کی نظر میں اپنی والدہ کی جانشین ثابت ہوئیں۔ خاندان کے افراد ان کے ساتھ بھی اسی طرح کی محبت و احترام سے پیش آتے جس طرح کہ ان کی مرحوم والدہ جناب خیر النساء بہتر صاحبہ کے ساتھ پیش آتے تھے۔

اصلاحی مشاغل:

حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کا تعلق رکھتی تھیں اور ذاکر و شاغل تھیں۔ لایعنی معاملات سے مکمل پرہیز کرتیں اور غیر مفید مجالس میں بالکل شرکت نہ کرتیں اپنے امکانات و وسائل کے مطابق مرحومہ نے اصلاح و دعوت کے عملی کام سے بھی دلچسپی لی۔ وہ ہر ہفتہ خواتین کا اجتماع کرتیں اور اس میں اصلاحی و دعوتی مضامین پڑھ کر سناتیں اور کبھی کبھی کسی عالم دین سے ان کے لئے وعظ کہلواتیں، اس اجتماع سے خاندان نیز قرب و جوار کی خواتین نے خاصا فائدہ اٹھایا، اور ماحول میں دینی جذبہ بیدار کرنے میں مدد ملی۔

امۃ اللہ تسنیم صاحبہ کی اولاد بچپنے ہی میں انتقال کر گئی تھی۔ ان کی یہ محبت بھی ان کے بھانجوں بھتیجوں پر صرف ہوئی۔ آج ان کی جدائی کو خاندان کے سب بڑے ایک عزیز بہن کی اور سب چھوٹے ایک شفیق خالہ و پھوپھی کی اور گرد و پیش کے لوگ ایک نیک اور مربی بی بی کی جدائی محسوس کر رہے ہیں اور سب غمزدہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا بدل عطا فرمائے۔ اور ان کی مثال بار بار پیدا کرے۔

پرنٹر، پبلشر، مسئول — سید محمد الحسنی نے
جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس
سے
طبع کرا کر دفتر تعمیر حیات ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔
ایڈیٹر: اسحٰق جلیس ندوی

کتابت: جلال الدین ... ندوی

دیباچۂ حدیقۂ نفسیات

(مولانا عبدالباری ندوی؁ نے مشہور ماہر نفسیات اور فلسفی جی۔ ایف۔ (اسٹوٹ) کی کتاب "مینول آف سائکالوجی" کا اردو ترجمہ کیا تھا — جو "حدیقۂ نفسیات" کے نام سے ۶۹۶ صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب کی شکل میں جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد کی طرف سے ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب پر بحیثیت مترجم جو دیباچہ موصوف نے لکھا تھا وہ درج ذیل ہے۔

اکثر دیکھا ہوگا کہ نجومی لوگوں کا محض نام پوچھ کر حال بیان کرتے ہیں۔ اسم اور مسمیٰ کے اس پُر اسرار رابطہ کی اگر کچھ بصیرت نصیب ہوتی، تو کم از کم یہ ناتواں مترجم تو ہرگز ایسے "شہ زور" (اسٹوٹ) مصنف سے پنجہ آزمائی کا حوصلہ نہ کرتا، خیر خدا اس حوصلہ شکن حوصلہ کا بھلا کرے کہ اس نے ترجمے کے نام سے ہیبت کے لئے ڈرایا۔ پروفیسر اسٹوٹ کے اس احسان کو کبھی نہ بھولوں گا۔

ہمارے محسن پروفیسر کا اپنے فن میں استناد و اعتبار ظاہر ہے۔ وہ نہ صرف متعدد بڑی بڑی انگلش اور یونیورسٹیوں میں معلم و ممتحن رہے ہیں بلکہ ان کی کتابیں اکثر یونیورسٹیوں میں پڑھی جاتی ہیں لیکن غریب مترجم کو مصنف کی صرف فن دانی سے دوچار ہونا نہیں پڑتا، بلکہ اس کی زبان دانی، طریق تفہیم و تعبیر اور سلیقۂ تصنیف و ترتیب وغیرہ کے نہ جانے کتنے ہفت خواں طے کرنا پڑتے ہیں۔

میں اپنے کو انگریزی داں بالکل نہیں کہہ سکتا، اس لئے جب بظاہر قصور زبان دانی کی بنا پر فہم مطلب کی راہ میں کوئی ٹھوکر لگی، تو اطمینان قلب کی خاطر ہمیشہ مستند انگریزی داں احباب کی طرف رجوع کیا۔ اور کبھی کبھی تو اُن احباب کی پوری پوری کونسل نے مدد فرمائی پھر بھی تشفی بخش فیصلہ مشکل ہی سے ہو سکا۔ اکثر ان کی زبان سے یہی سُنا کہ "عجیب و غریب انگریزی ہے"۔

اس سے بڑھ کر یہ بیچارے مترجم کا علم زیادہ سے زیادہ نفس فن تک محدود، مگر حضرت مصنف کے وسیع دائرۂ علم میں موسیقی مصوری وغیرہ جیسے دیگر علوم و فنون داخل ہیں، اب کا استعمال ضمنی و ذیلی مدد زائد ہی فرماتے ہیں۔ اس مشکل کے لئے بھی خدا جانے دروازوں کو جھانکنا پڑا اور صاف کہنا چاہئے کہ جابجا ان چیزوں کا ترجمہ بے سمجھے کرنا پڑا ہے۔

اصل یہ ہے کہ درسی کتابیں، بالعموم اور ان میں بھی جی۔ الیف۔ اسٹوٹ صاحب کی "مینول آف سائکالوجی" کی سی بالخصوص ترجمہ کے بجائے اخذ و تلخیص کے لئے زیادہ موزوں ہوتی ہے۔ باقی مترجم کی جان لینے کا حق اگر حاصل ہے تو صرف نہ مرنے والی (کلاسکل) کتابوں کو، نہ کہ حشرات الارض کی طرح روز پیدا اور فنا ہونے والی کتابوں کو۔

بہر حال مجھ کو اپنے ترجموں سے یوں بھی کبھی اطمینان نہیں ہوا اور انگلش ترجمہ سے تو قطعاً غیر مطمئن ہوں۔ اس کے پڑھنے پڑھانے والے ارباب علم سے خاص طور پر درخواست ہے کہ جو غلطی نظر آئے مترجم کے اعلان جہل کی غرض سے نہیں، کہ وہ سراپا "جہول" ہے البتہ اصلاح کی نیت سے ضرور مطلع فرما دیں۔ تاکہ اگر طبع ثانی کی نوبت آئے تو صحت ہو جائے۔

جن دوستوں سے تھوڑی یا بہت مدد ملی ہے ان کا دل سے منت پذیر ہوں۔

والسلام

ظلوم و جہول

عبدالباری ندوی

۲۰ صفر ۱۳۴۷ھ

براہِ کرم جواب طلب امور کے لئے جوابی خط بھیجئے

مولانا عبدالباری ندویؒ

اپنے رفیق قدیم مولانا عبدالماجد دریابادی کی نظر میں

ہم سن میں مولانا سے کوئی دو ہی تین سال چھوٹا ہوں، درسی تعلیم میں بس تقریباً ساتھ ہی ساتھ رہا، وہ دارالعلوم ندوہ میں تھے اور میں لکھنؤ کے کیننگ کالج میں، تعلیم متوازی... (PARALLEL) چل رہی تھی، ان کا وطن اکثر بہی ضلع بارہ بنکی ہی کا ایک دور افتادہ گویا تھا اور مستقل یکجائی میری ان کی لکھنؤ ہی رہتی تھی تعارف ۱۹۰۹ء میں ہوا، اور دو ہی ایک سال میں یگانگت اتنی بڑھی کہ گمان عزیز داری کا ہونے لگا، مشترک موضوع ہمارے ان کے مزاج فلسفہ اور عقلی علوم تھے، نوجوانی کے جوش میں زبان پر اور قلم سے ہر وقت یہی بحثیں جاری رہتی تھیں، ایک مردم شناس مبصر نے اسی وقت یہ فقرہ کہہ ڈالا کہ "ماجد صاحب کا مطالعہ جتنا بھی ہو۔ اور فلسفہ کی کتابیں جتنی بھی انھوں نے پڑھ ڈالی ہوں لیکن فلسفی کہلانے کے مستحق باری صاحب ہی ہیں!"

یہ بات میرے دل میں اتر گئی اور میں تو چارپائے بر و کتابے چند" کا مجموعہ بنا رہا البتہ وہ فلسفی سے ترقی کر کے متکلم اور صوفی بن گئے، لیکن عقلیت جیسے ان کی سرشت میں تھی، باوجود اپنے تقشف و تصلب کے محض تسبیح و سجادہ کے صوفی ہو کر نہیں رہے، بلکہ بقدر ضرورت برابر مغربی فلسفہ اور اس سے بھی بڑھ کر ماڈرن سائنس خصوصاً شعبۂ طبیعیات سے ربط اور ان کا مطالعہ قائم رکھا، اسکی شاہد عادل تو یہ کتاب بھی ہے اور اگر خارجی کوئی شہادت مطلوب ہو تو اس کے لئے اس کتاب کے مقدمہ نگار ڈاکٹر رضی الدین وائس چانسلر پشاور یونیورسٹی کا نام کافی ہے۔ ان کا شمار خود وقت کے مستند اور مستند ماہرین فن میں ہے۔

(کتاب "مذہب اور سائنس" سے)

بقیہ ص ۱: اپنی کہانی اپنی زبانی

اب خیال کرتا ہوں کہ عرب و عجم کے صاحب علم و قلم حضرت علی میاں کے مقام کو کچھ بھی اس وقت پہچان سکتا تو یقیناً اپنی جگہ چھوڑ کر طالب کی صف میں جا بیٹھتا، من تواضع للہ رفعہ اللہ کی یہ کیسی جیتی جاگتی مثال ہے کہ جو آج ان کے سامنے طفل مکتب ہے اس سے بھی ان کو کوئی بات کام کی ملتی نظر آتی تو اس میں تامل نہ فرماتے، بارک اللہ فی برکاتہم "مذہب اور سائنس" کی کتاب میں بھی انھیں کی برکات کا حصہ ہے۔

اور اب الحمد للہ "مذہب اور سائنس" کے نام سے پیش کش کتاب بھی انھیں کے قائم فرمودہ ادارہ "مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" سے شائع ہو رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ حضرات بالا کی برکات سے اس پیش کش کو بھی پیش کرنے والے کی دنیا و آخرت کے لئے قبول فرمائیں۔

(کتاب "مذہب اور سائنس" سے ماخوذ)

قابلِ توجہ

"تعمیر حیات" کی قیمت لاگت سے بہت کم رکھی گئی ہے، تاکہ زیادہ سے زیادہ حضرات مستفید ہو سکیں۔ اس لئے اہل استطاعت حضرات سے پُر زور گذارش ہے کہ حوصلہ مندی سے عطیات عطا فرما کر دینی لٹریچر کی نشر و اشاعت اور ادارہ کی اعانت میں حصہ لیں۔ ان حضرات کی خدمت میں "تعمیر حیات" برابر ارسال کیا جائے گا۔

معاونین خصوصی و لائف ممبر -/500 معاونین -/250 اعزازی خریداران سے سالانہ -/50

(منیجر)

ایک فلسفی تھا نہ رہا

پروفیسر عبدالباری ندوی مرحوم

حیات اور کارنامے

"۳ جنوری ۱۹۷۶ء کو فیلسوف اسلام پروفیسر عبدالباری ندویؒ وفات پا گئے۔"

زمانہ کی ادا شناسی، فلک کج رفتار کی ناہنجاری، نئی پود کی بے خبری، اخبارات کی بے اعتنائی دیکھئے کہ چند اخبارات کے سوا کسی میں ان کے حادثۂ وصال کی خبر تک شائع نہ ہوئی ؎

اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی

جب کہ یہ وہ عبقری شخصیت تھی جس کے قلم سے نصف صدی سے زائد علوم نقلیہ و فلسفہ و سائنس فیضیاب ہوتے رہے۔ اور انہوں نے سائنس دانوں و فلسفیوں کو "سجدۂ سہو" کرا کر ہی دم لیا، اس مضمون میں پروفیسر ندوی مرحوم کے اوراق حیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جس سے ان کی شخصیت، ان کی خدمات، اور ان کی علمی پوزیشن واضح ہوگی، کاش کہ علمی و تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے ان کی گہرائی و گیرائی میں ڈوبی ہوئی خدمات مہمیز کا کام دیں —

—— ابھی یگانۂ روزگار مصنف، مقبول و مشہور اہل قلم رئیس احمد جعفری ندوی مرحوم ہی کا غم بھول نہ پائے تھے کہ مشہور مؤرخ و محقق پروفیسر نجیب اشرف ندوی کے حادثۂ انتقال کا زخم و صدمہ برداشت کرنا پڑا، ابھی یہ زخم ہرا ہی تھا کہ ندوہ کے گل سرسبد مولانا مسعود علی ندوی اللہ کو پیارے ہو گئے، ابھی زخم بھی مندمل نہ ہونے پایا تھا کہ مشہور مصنف، شوخ نگار ادیب، جانشین سلیمان اعظم مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا انتقال پُر ملال ہو گیا، ابھی ان کے آنسو تک خشک نہ ہونے پائے تھے کہ ندوی برادری کی سب سے قدیم، سب سے بزرگ دیو قامت شخصیت، عالم بے بدل، علم و عمل کا سنگم، تقویٰ و طہارت کا نشان، بے مثال فلسفی پروفیسر عبدالباری ندوی مرحوم کا حادثۂ فاجعہ پیش آ گیا ؎

جب غم ہی ہو جانگداز تو غمخوار کیا کریں

علامہ شبلی نعمانیؒ کی معنوی اولاد میں جو نام زبان زد خلائق تھے ان میں آبروئے تحقیق علامہ سید سلیمان ندوی مرحوم زبان کے خالق مولانا ابوالکلام آزادؒ، نعت و بلاغت کے امام مولانا حمید الدین فراہیؒ، ادب و تحقیق کے گوہر آبدار مولانا عبدالسلام ندویؒ، نظم و نسق کے حرف آخر مولانا مسعود علی ندویؒ، ایجاز و اختصار کے شہنشاہ جدید و قدیم کا سنگم مولانا عبدالماجد دریابادی کے ساتھ فلسفہ و عقلیات کا کامل استاد بلکہ سند کا درجہ رکھنے والے یہ پروفیسر عبدالباری ندویؒ بھی تھے۔

علامہ شبلی مرحوم کی نظر انتخاب ان پر شروع ہی سے رہی، مولانا ندوی مرحوم کو فلسفہ و عقلیت سے ذوق، زبان و ادب کا چسکا، فلسفہ کا چٹخارہ، تحقیق سے مناسبت، دینیات سے دلچسپی، مطالعہ کا شغف یہ سب مولانا شبلیؒ کی نگاہ فیض اثر کا

منصور نعمانی ندوی

نتیجہ تھی، علامہ سید سلیمان ندویؒ نے ان کو "دور جدید کا معلم" اور "مجمع علم و فن" کہا۔ ڈاکٹر اقبالؒ نے "استاد الکل" اور فرمانروائے بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ نے تاریخ اسلام کا ایک باکمال اور مستند مؤرخ" قرار دیا۔

شبلیؒ "اردو کے عناصر خمسہ" میں سے ہیں، انکے شاگردوں میں بھی تحریر کی خوبی لازمی تھی، اسی باعث تو شبلی کا ہر شاگرد اپنے وقت کا استاد ہوا ہے، اور اس نے شبلی کی سی انفرادیت قائم رکھتے ہوئے شبلی کے آستانہ فیض سے تعلق پر فخر و ناز کیا ہے مولانا عبدالباری ندوی کا خاص موضوع فلسفہ و علوم عقلیہ تھا انہوں نے اس موضوع پر اسی انداز سے لکھا ہے کہ فلسفہ جیسے خشک موضوع کو باغ و بہار بنا دیا ہے، ان کا اسلوب منفرد، ان کا شعور تربیت یافتہ، ان کا دماغ متجسس ان کا ذہن شگفتہ و پاکیزہ، شگفتہ ادبی ذوق، وسیع علم و مشاہدہ، سادگی و خوش نوائی ان کی تحریر میں بغیر معمولی کشش، جاذبیت، قوت تاثیر پیدا کر دی ہے، فلاسفہ کی خشک مزاجی، علماء کی تمکنت، صوفیاء کی خاموشی مشہور ہے، مولانا عبدالباری ان تینوں خوبیوں سے مالامال تھے، ان میں فلسفی کا وقار، عالم کا جلال، اور صوفی کا سکوت تھا لیکن حد کے اندر گفتگو کیجئے تو یہ نامور فلسفی شگفتہ مزاج، بذلہ سنج نظر آتا ہے، گفتگو میں شوخی کی چاشنی، طنز لطیف کی جھلکی، ادبی چٹخارہ، تصوف کے نکات بیساختہ بیان کر جانے سے

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

کے مصداق لیکن اس ناموری و شہرت کے بعد بھی سادگی بحالہٖ؟ و فروتنی کا مجسمہ تھے، سچ پوچھئے تو ان کی سادگی میں ایک جلال تھا، خاکساری میں ایک وقار، فروتنی میں ایک دبدبہ تھا۔

۱۴ ذی الحجہ ۱۳۰۶ھ مطابق یکم اگست ۱۸۸۹ء بمقام کرسی ضلع بارہ بنکی میں ملازمت کرتے تھے لڑکپن کا عرصہ وہاں گزرا، ابتدائی تعلیم سترکھ قصبہ میں پائی۔ ندوہ ابھی دونوں عالم وجود میں آیا تھا اور اس کی شہرت مولانا محمد علی مونگیریؒ اور مولانا حکیم عبدالحی صاحب مرحوم کی وجہ سے بہت تھی — حکیم عبدالخالق مرحوم سے حکیم عبدالحی صاحب کا یہ تعلق تھا کہ عبدالخالق صاحب، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی جیسے بزرگ سے فیضیاب تھے اور حکیم عبدالحی صاحب کو مولانا نعیم صاحب سے شرف تلمذ حاصل تھا، اسی قربت نے ان کو عبدالباری صاحب کو ندوہ میں داخل کرانے پر آمادہ کیا، ندوہ میں داخل ہوئے لیکن وطن سے دوری کی بنا پر تعلیم سے اکتاہٹ رہی اور خاطر خواہ تعلیم کی طرف توجہ نہ کرنے کی وجہ سے عبدالخالق صاحب نے ان کو مولانا محمد ادریس صاحب کی خدمت میں نگرام بھیج دیا، انہوں نے باری صاحب پر خصوصی توجہ کی، مولانا ادریس صاحب عالم بے نظیر تھے، بالغ نظر صوفی بھی تھے، ان کی صحبت فیض اثر نے عبدالباری صاحب کو طلب علم پر اُبھارا، مطالعہ کا ذوق و شوق پیدا کیا، دین سے دلچسپی پیدا ہوئی۔ اب اس جس خام کو کندن بننا تھا ان کے والد نے باری صاحب کی تعلیمی حالت دیکھ کر دوبارہ ندوہ میں داخل کر دیا۔ دوبارہ ندوہ میں داخلہ ۱۳۱۹ھ میں ہوا، اب ندوہ کا رنگ ہی دوسرا تھا علامہ شبلی نعمانی مرحوم کی معتمدی کا "سنہری دور" شروع ہو چکا تھا، اس دور میں ندوہ نے جو ترقی کی اس کی مثال نہیں ملتی، تحقیق کا ذوق ندوہ میں عام ہوا، علم و فن سے دلچسپی بڑھی، تاریخ کا چرچا ہوا، سیرت کا ذکر ہوا، ادب عربی کا زور ہوا، تحریر سے مزاجیت بڑھی تقریر کا غلغلہ بلند ہوا، دیکھتے ہی دیکھتے شبلیؒ کی صحبت فیض اثر سے سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندویؒ بڑھے اور آسمان ندوہ پر چھا گئے، عبدالسلام ندوی منظر عام پر آئے اور اپنی خداداد صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا، ضیاء الحسن ندوی نے دھوم مچائی، ابوالظفر ندوی نے جوہر دکھانا شروع کئے، ابوالکلام کی سی دیو قامت شخصیت ابھری، عبدالماجد دریابادی اپنے منفرد اسلوب میں جلوہ گر ہوئے، عبدالباری ندوی بھی اپنے منفرد رنگ میں جلوہ آرا ہوئے، علامہ شبلی کی سرپرستی میں "الندوہ" نکلا تو اس میں شبلی کا یہ حلقہ چھایا رہا، اور اس کے معیاری علمی، تحقیقی مضامین و مقالات کی ارباب علم و ادب نے خوب داد دی —

اب ندوہ میں تعلیم مکمل کر چکے تھے، چاہتے تھے کہ انگریزی پڑھیں کیونکہ فلسفہ پر انگریزی میں بہت مواد تھا، ندوہ میں تھوڑی بہت انگریزی سے واقفیت پیدا کر لی تھی۔ اس عزم کا جب اپنے والد سے اظہار کرتے ہیں تو وہ پرزور مخالفت کرتے ہیں اور انگریزی کے نام پر جیب خرچ بند کر دیتے ہیں، عبدالباری صاحب اپنی اس پریشانی کا اظہار اپنے محبوب و محسن استاد علامہ شبلیؒ سے کرتے ہیں وہ ان کی بات مانتے ہیں اور ندوہ ہی میں انگریزی کی تعلیم کا بندوبست اور قیام و طعام کا انتظام کرا دیتے ہیں، جب چلے تو استاد سے خواہش ظاہر کرتے ہیں کہ فلسفہ کے لکچر سننے کے لئے کسی کالج میں بھیج دیجئے، استاد محترم علی گڑھ سفارش کرتے ہیں وہاں قواعد کی سختی کی بنا پر اجازت نہیں ملتی وہاں سے بے نیل مرام واپس آ جاتے ہیں۔ اب تمام راستے مسدود دیکھ کر استاد سے کہتے ہیں مجھے کسی علمی خدمت کے لئے جگہ دلوایئے چنانچہ علامہ شبلیؒ کی کوششوں سے سلطان پور ہائی اسکول میں ہیڈ مولوی کی جگہ پر تقرر ہوا وہاں" اگست ۱۹۱۲ء سے مارچ ۱۹۱۵ء تک عربی کے استاد رہے۔"

(مکاتیب گیلانی ص ۱۵)

اسی اثناء میں علامہ شبلیؒ اپنے وسیع شاگردوں کے حلقہ کو سوگوار چھوڑ کر اللہ کو پیارے ہو جاتے ہیں علامہ شبلیؒ کی آرزو و خواہش تھی کہ سیرۃ النبی مکمل ہو جائے اور دارالمصنفین کا قیام

عمل میں آجائے، اس کا اظہار علامہ نے اپنے شعر میں بھی کیا ہے ؎

گر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

سید الطائفہ علامہ سید سلیمان ندوی اس وقت دکن کالج پونہ میں فارسی کے پروفیسر تھے، اپنے شفیق استاد کے انتقال کے بعد ان کے حکم اور وصیت کے مطابق پروفیسری کو خیرباد کہہ کر اعظم گڈھ چلے آتے ہیں اور سیرۃ النبیؐ کی تکمیل اور دارالمصنفین کے قیام پر غور کرنے لگتے ہیں، اپنے ساتھ عبدالسلام ندوی، حمید الدین فراہی، مولانا مسعود علی ندوی کو لے کر دارالمصنفین کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ دارالمصنفین علامہ شبلیؒ کے خوابوں کی حسین تعبیر، علامہ سید سلیمان ندویؒ کے خون جگر کا نتیجہ، مسعود علی صاحب ندوی کی کوششوں کا ثمرہ، مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی انتھک محنتوں کا نچوڑ، مولانا ریاست علی ندوی کی صلاحیتوں کا اعتراف، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی جگر کاری و دماغ سوزی کا شاہکار، مولانا ابوالحسنات ندوی مرحوم کی جواں قلمی کا ثبوت، مولانا عبدالباری ندوی کے مشوروں، تعاون کا رہین منت، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم کے سوز جگر اور سوز قلم کا نتیجہ، مولانا عبدالماجد دریابادی کے سایۂ خلوص کا مظہر، صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی علمی و تحقیقی جانکاہیوں کا مرہون احسان، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کے ایثار و قلم کا نشان ہے ان سب کی محنتوں اور کوششوں سے عروس البلاد بغداد کے دارالحکمت کی طرح ہندوستان کا دارالحکمت دارالمصنفین کو بننا نصیب ہوا ؎

دا تا رکھے آباد ساقی تیری محفل کو

علامہ سید سلیمان ندویؒ اعظم گڈھ آتے ہیں تو اپنے عزیز فلسفی دوست مولانا عبدالباری ندوی کا نام نامی دکن پونہ کالج کے لئے پیش کر دیتے ہیں، شعبۂ فارسی دکن پونہ کالج کے شعبۂ فارسی کے صدر شیخ عبدالقادر تھے خود صاحب علم اور ارباب علم وفضل کے قدرداں بھی۔ انہوں نے عبدالباری صاحب ندوی کی صلاحیتوں کا اعتراف اس طور پر کیا کہ سید صاحب کی جگہ لکچررشپ انہیں عطا کردی، وہاں عبدالباری صاحب نے فارسی کے لکچرز انگریزی میں دئے، وہاں یکسوئی میسر آئی تو فلسفہ کی کتابوں کا ترجمہ شروع کر دیا، ان کو برکلے سے خاص دلچسپی تھی اس کی مشہور کتاب کا ترجمہ "مبادی علم انسانی" کے نام سے کیا، یہ ترجمہ دارالمصنفین سے شائع ہوا اس ترجمہ کے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں "مبادی علم انسانی" اردو میں فلسفۂ جدیدہ پر پہلی کتاب ہے"۔ اس کے بعد برکلے کی سوانح لکھی جس میں اس کی فلسفیانہ کتابوں کی ناقدانہ تلخیص اور اس کے فلسفہ پر تشریح و تنقید ہے۔ یہ کتاب بھی دارالمصنفین سے بہت اہتمام سے شائع ہوئی۔

اسی درمیان میں شیخ عبدالقادر کا تبادلہ بمبئی ہو جاتا ہے اور مولانا عبدالباری صاحب کا تبادلہ گجرات کالج احمد آباد، انہی دنوں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ احمد آباد میں ہونا طے پایا، اس اجلاس کی صدارت کے لئے بمبئی کے وزیر تعلیم سر ابراہیم رحمت اللہ مقرر ہوئے، کانفرنس کے بانی نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے عبدالباری صاحب کو لکھا آپ کو تقریر یا تحریر کرنا ہے۔ عبدالباری صاحب نے کچھ اشارے کاغذ پر نوٹ کر لئے، اور اجلاس کے موقع پر اس کی مدد سے ایک گھنٹہ تک تقریر کی۔

اس تقریر کی بڑی دھوم ہوئی، یہ تقریر مرتب ہو کر کانفرنس ہی کی طرف سے شائع ہوئی۔

"مذہب و عقلیات" یہ وہی تقریر ہے جس کو وہ قبولیت عام عطا ہوئی جو مولانا کی کسی کتاب کو نصیب نہ ہوئی، مولانا مرحوم نے اپنے پیر و مرشد (ماجد میاں کی زبان میں) "حکیم الامت" حضرت تھانویؒ کو برائے ملاحظہ ارسال فرمائی تو اس پر دو لفظی گنا وقیع تبصرہ فرمایا "مذہب کا آہنی قلعہ ہے" مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہٗ ۱۳ فروری ۱۹۷۶ء کے "صدق جدید" میں لکھتے ہیں "اپنی جوانی میں ایک رسالہ مذہب و عقلیات پر بہ قامت کہتر بقیمت بہتر بہت خوب لکھا تھا اس کے بعد گویا لکھنا بھول گئے"۔

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی مملکت آصفیہ میں جامعہ عثمانیہ میں مذہبی امور کے نگراں و صدر الصدور مقرر ہوئے، خود بھی پایہ کے عالم، کہنہ مشق ادیب و ناقد تھے اور ارباب علم وفضل کے قدرداں بھی، ان کے زمانہ قیام ہی میں مولانا مناظر احسن گیلانی شعبۂ دینیات کے صدر ہوئے، اور مولانا عبدالباری ندوی بھی شعبۂ فلسفہ کے صدر، دو سال مدت ملازمت کو بیت گئے، حسب قاعدہ مستقل کا معاملہ اعلیٰ حضرت کی خدمت میں ہوا، اعلیٰ حضرت کے منہ لگے مصاحبوں نے پہلے ہی یہ چغلی لگادی کہ شیروانی صاحب نے ایک ایسے بے علم شخص کو شعبۂ فلسفہ کا صدر بنایا ہے جو مروجہ ڈگریوں میں کوئی ڈگری نہیں رکھتا، اعلیٰ حضرت نے فوری جواب طلب کیا ادھر شیروانی صاحب نے جواب میں "مذہب و عقلیات" نامی رسالہ کسیاتھ یہ عریضہ ارسال کر دیا۔ "یہ ان کی سند ہے فلسفہ نے انکے ہاتھ پر اسلام قبول کیا ہے، جس کا اندازہ سرکار خود رسالہ سے لگا سکتے ہیں"۔ اعلیٰ حضرت نے کتاب بڑے ذوق و شوق سے پڑھی اور لگائی ہوئی چغلی جھاگ ثابت ہو کر رہی۔ مستقلی کے کاغذ پر فوری دستخط کر دئے۔

جامعہ عثمانیہ ہی کے قیام کے زمانہ میں مولانا ندوی نے ابی ڈیکارٹ کی کتاب کا ترجمہ "طریق اور تفکرات" کے نام سے کیا جو کہ دارالطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد سے ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا، اس کے بعد ولیم جیمس کی کتاب کا ترجمہ "فلسفۂ نتائجیت یا فلسفہ پر عام فہم محاضرات" کے نام سے کیا، یہ بھی مندرجہ بالا مطبع سے ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد ڈیوڈ ہیوم کی کتاب کا ترجمہ "فہم انسانی" کے نام سے کیا یہ دارالمصنفین سے شائع ہوا۔

"ستمبر ۱۹۳۳ء میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد گئے اور مسلسل ۲۳ سال تک جامعہ کے شعبۂ فلسفہ اور آخر میں شعبۂ دینیات کی بھی خدمت کی جولائی ۱۹۵۵ء میں ریٹائر ہوگئے"۔

(مکاتیب گیلانی ص ۱۱)

زمانۂ قیام حیدرآباد میں مولانا گیلانی کے ہم پیالہ و ہم نوالہ رہے ۱۹۳۹ء میں مولانا گیلانی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی معیت میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی مولانا گیلانی اور مولانا عبدالباری ندوی دونوں دمہ کے مریض تھے۔ مولانا عبدالباری ندوی نے کس لطیف پیرایہ میں اس کا ذکر کیا ہے: "قیام حیدرآباد کے زمانہ میں فاضل گیلانی کے ساتھ ہم قیامی ہم طعامی ہی حاصل نہیں رہی، دمہ کے مرض میں "ہمدمی" بھی رہی، فاضل گیلانی کو گرمیوں میں دورے پڑتے تھے اور مجھے جاڑوں میں"۔

(مکاتیب گیلانی ص ۱۲)

علمی دنیا کا ایک حیرت انگیز و عظیم کارنامہ اس مرد درویش نے انجام دیا ہے اور استاد کی شاگردی کا حق ادا کر دیا۔ جب سید سلیمان ندوی سیرۃ النبیؐ کی تکمیل کر رہے تھے تو اس وقت انہوں نے اپنے اس فلسفی دوست سے خواہش ظاہر کی کہ معجزات اور فلسفۂ جدیدہ کا باب آپ مکمل کیجئے، اس کا استحقاق آپ ہی کو ہے چنانچہ فلسفی دوست نے اپنے عزیز محقق دوست کی بات مانی اور اس باب کو خوش اسلوبی سے مکمل کر کے سیرۃ النبیؐ کے اس عظیم الشان کارنامہ میں اپنے کو شریک کر لیا۔

اس باب کو مکمل کر کے ارسال کرنے پر سید سلیمان ندویؒ نے سیرۃ النبیؐ جلد سوم کے مقدمہ میں پروفیسر عبدالباری کی عالمانہ فلسفیانہ محققانہ انداز کی یوں داد دی ہے:۔ "ہماری جماعت بلکہ علماء کی جماعت میں پروفیسر عبدالباری ندوی (معلم فلسفۂ جدیدہ عثمانیہ یونیورسٹی) سے بڑھ کر کوئی ماہر نہیں، معجزات کی بحث میں ضرورت تھی کہ اس باب میں فلسفۂ جدیدہ کی جو موشگافیاں اور نکتہ آفرینیاں ہیں ان سے بھی تعرض کیا جائے، چنانچہ میری درخواست پر موصوف نے معجزات اور فلسفۂ جدیدہ کا باب لکھ کر عنایت کیا ہے جو اس کتاب کے ص ۱۱ سے ہو کر ص ۲۱ پر تمام ہوا ہے"۔

"حیات سلیمان" میں شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم ص ۳۱۰ پر رقمطراز ہیں:۔ "۱۹۲۳ء میں سید صاحبؒ نے سیرت کی تیسری جلد لکھی۔ یہ جلد معجزات پر ہے اس کا کچھ حصہ مولانا عبدالباری ندویؒ کے قلم سے ہے جس کی تصریح مقدمہ میں موجود ہے۔ یہ جلد ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی"۔

مولانا منت اللہ صاحب رحمانی ندوی (امیر شریعت بہار و اڑیسہ) لکھتے ہیں: "مولانا ہندوستان کی ان منفرد شخصیات میں سے ہیں جنہیں قدرت نے علم و عمل دونوں میں ممتاز مقام بخشا ہے، مولانا فلسفۂ جدیدہ اور اسلامیات پر گہری نظر رکھتے ہیں اور طرز بیان بہت سلجھا ہوا اور موثر ہے"۔

(مکاتیب گیلانی ص ۱۱)

مولانا عبدالباری ندوی ان لوگوں میں سے تھے جو دینی ملی مسائل پر سنجیدہ فکری انداز میں لکھتے رہے، مولانا کا ایک عظیم کارنامہ یہ بھی ہے کہ انہوں نے حضرت تھانویؒ کی تعلیمات کو سہل و عام فہم بنایا، اس سلسلہ کو عوام نے قدر کی نگاہوں سے دیکھا۔ "تجدید معاشیات" "حضرت تھانویؒ" کے اقتباسات پر مشتمل ایک کارآمد چیز ہے، "تجدید تصوف" یہ بھی اسی سلسلۂ ذہبیہ کی اہم کڑی ہے، اس میں تصوف کے اسرار و رموز کو عام بنایا، اس کا عربی ترجمہ "التصوف والحیاۃ" کے نام سے استاذی مولانا سید محمد رابع صاحب حسنی ندوی (ادیب اول دارالعلوم ندوۃ العلماء) نے بہت خوب انداز میں کیا ہے، عالم عرب میں بھی اس ترجمہ کو قدر کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ ایک کتاب "نظام اصلاح و صلاح" کے نام سے اور ترتیب دی تھی اس میں سورۂ عصر کی روشنی میں مسلمانوں کی انفرادی، اجتماعی، فکری، علمی غلطیوں کی مصلحانہ انداز میں نشاندہی کی ہے اور اصلاح کی تدابیر بھی بتائی ہیں یہ کتاب مجلس علمی کراچی سے شائع ہوئی اور قدر کی نگاہوں سے دیکھی گئی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کے تعلقات تقریباً ۷۰ سال رہے، دوستی و تعلق میں ان کو یاد اس نام سے کرتے ہیں:۔ "فکر و فہم حضرت تھانویؒ سے لی؟ اور انداز تحریر مولانا شبلی رحمۃ اللہ سے۔ لکھتے خوب ہیں، میں اپنی تحریروں میں ان کا ذکر اکثر "ایک تھانوی الفکر شبلی القلم" کے

(بقیہ صفحہ ۱۵ پر)

مولانا عبدالباری ندویؒ

مولانا عبدالماجد دریابادی

شناساؤں اور کرم فرماؤں میں کسی کی بھی دوستی کی عمر اُن سے زیادہ طویل نظر نہیں آتی مجھ سے سن میں دو ڈھائی سال بڑے ہوں گے دیر سے دیر ۱۹۱۲ء سے ملاقات ہے اب ۱۹۷۶ء ہے گویا کم سے کم ۶۴ سال دوستی کو ہوئے۔ ایک چھوٹا سا البم بجائے خود ہے۔

رہنے والے بارہ بنکی ہی کے کسی غیر معروف قصبہ یا موضع کے ہیں۔ پیدائش ایک بدنام قصبہ کرسی میں ہوئی لڑکپن کا ایک بڑا حصہ قصبہ گدیہ میں گزرا۔ اور میری ملاقات اسی زمانہ سے ہے وہیں ان کے والد مولوی حکیم عبدالخالق طبیب تھے اور چھوٹے سے تعلقہ گدیہ کے ملازم۔ دینی تعلیم نگرام میں پائی اور پھر عرصہ تک ندوہ میں رہ کر (اور شاید کچھ دن فرنگی محل میں بھی) ندوہ میں مولانا سید سلیمان، مولوی عبدالسلام وغیرہ کے زمانہ میں تھے گو ان سے بہت نیچے۔ مولانا شبلیؒ کے ان حاضر باشوں میں تھے ان سے بہت مستفید ہوئے۔

پہلی ملاقات غالباً بانسہ کے عرس میں ہوئی، بانسہ والے میرے تو عزیز قریب ہی تھے۔ یہ بھی اس وقت تک وہاں عرس میں کبھی کبھی آ جاتے تھے۔ پھر ندوہ کی طرف سے وفد میں دریاباد جون ۱۹۱۲ء میں آئے جس سے راہ و رسم قائم ہو گئی۔ میں کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھنے آ گیا تھا اور وہ ندوہ کے ہوسٹل میں تھے۔ ملاقات اکثر ہوتی رہتی۔ اور زیادہ تر میرے ہاں آتے۔ علمی، ادبی، معاشرتی مذاق کا اشتراک محبت و ارتباط کا باعث ہوا۔ کتاب وہ زیادہ نہ پڑھتے (کتاب کا کیڑا تو میں گرفتہ سوز ہی تھا) البتہ ذہانت اور تیزی فکر میں بہت آگے تھے۔ میں کتابوں مقالوں کا خلاصہ ان سے بیان کر دیتا اور وہ ان پر بحث شروع کر دیتے۔ اصل موضوع انگریزی، فلسفہ، منطق اور نفسیات تھے اور مطالعہ گویا ہم دونوں کا ساتھ ہوتا رہتا۔ میری تشکیک اور بے دینی بڑھتی رہی اور یہ بچارے اپنی والی کوشش میری تسکین و تشفی کی کرتے رہتے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کوئی کھلا ہوا دشمن اسلام مل جاتا جیسے کوئی مشہور پادری اور اس کا مقابلہ ہم دونوں مل کر اسلام کے دفاع میں کرتے۔ میں نے کورس میں عربی لی تھی اور انھیں پرائیویٹ انگریزی پڑھنے کا شوق ہوا۔ میں نے ان سے عربی کچھ دن سبقاً سبقاً پڑھی اور انہوں نے مجھ سے انگریزی۔ مجھے تو عربی کچھ آئی وائی نہیں البتہ انہوں نے انگریزی مطالعہ بھر کی ضرورت کی سیکھ لی جس نے

جب شادی کا ارادہ کیا اور شادی بھی کر ڈالی تو وہ بالکل نجی معاملات گفتہ و ناگفتہ بہ میں بھی میرے رازدار اور شریک کار رہے اور انھیں بھی جو واردات قلب اس سن میں پیش آئے تو ان میں وہ اپنے اعتماد سے مجھے نوازتے رہے! لکھنؤ میں میرا قیام مستقل تھا اور ان کا اکثر باہر رہنا ہونے لگا۔ کبھی اعظم گڈھ، کبھی پونا، کبھی بمبئی وغیرہ۔ جب باہر سے آتے میرے ہی ہاں ٹھہرتے اور میں کبھی کبھی اپنی بے نفسی سے میزبانی کے اولیں فرائض سے بھی ٹال جاتا۔ برسوں بعد جب حج کو روانہ ہوا تو (۱۹۲۹ء تھا) میں تو یہ بھی اپنے والدین اور چھوٹے سے قافلہ کے میرے ساتھ ہی چلے اور ساتھ رہے۔ اسی طرح جب اپنی پہلی شادی کی تو میرے صلاح و مشورے سے، اور میرے دور کے ایک سسرالی عزیز کے ہاں۔

میری اکثر باتوں پر مجھے بڑے اچھے انداز میں ٹوک دیتے اور میں ان کا احسان مند ہوں کہ بعض خانگی معاملات میں انہوں نے مجھے زیادتیوں سے روکے رکھا اور والدین کے زمانے میں ان کی ناز برداریوں کی راہ میں بہت دور تک جانے سے باز رکھا اور میں نے اگر ان کی رائے پر عمل نہ کیا ہوتا تو بڑی خرابیوں میں پڑ گیا ہوتا جولائی ۱۹۲۸ء میں جب ہم تلاش مرشد میں نکلے، اور سہارنپور چلے ہیں تو یہ میرے رفیق طریق تھے۔ ضابطہ سے جو تعلق مولانا حسین احمد مدنی سے ہوا اور عملاً جو تعلق اصلاح مولانا تھانویؒ سے رہا اس میں بھی یہ میرے ساتھی اور ساجھی رہے۔

دنیا بہر حال دنیا ہی ہے۔ جنت نہیں ہے یہاں کسی تعلق کو بھی سو فیصدی اور دائمی ہمواری نصیب ہو سکتی ہے؟ بارہا ان سے بھی اختلافات ہوئے اور شکر رنجیاں بلکہ تلخیاں بھی پیش آتی رہیں ——— جب صحابہ کرامؓ تک باہم ان بشری لغزشوں سے محفوظ نہ رہ سکے تو ہم گندے بندوں کا ذکر ہی کیا ہے۔ اخلاص خلوت کامل کا ظہور ناسوت میں نہیں صرف عالم آخرت ہی میں ہو گا۔

"ونزعنا ما فی صدورھم من غل"

(اعراف ع ۵)

(اور ہم دور کر دیں گے (جنتیوں سے) جو کچھ غبار ان کے دلوں میں رہا ہو گا (دنیا میں)

ابتدائی زمانہ تنگدستی کا تھا پھر اوسط درجہ کی فراغت حاصل ہوگئی۔ حیدرآباد جا کر کچھ اور اچھے خوش حالوں میں شمار ہونے لگا۔ سواری میں موٹر رہنے لگا۔ ۱۹۱۹ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ تالیف و ترجمہ سے رخصت ہوا۔ تو اپنے جانشینوں کے جو تین کام پیش کر آیا تھا اس میں شاید پہلا نام انھیں کا تھا۔ شعبۂ فلسفہ میں تعلیم دینے کو بلائے گئے چند سال بعد ایک انگریز نگراں (مسٹر میکنزی) کا دورہ ہوا تو شعبۂ دینیات میں تبدیل کر دئے گئے! لکھنؤ میں شہر کے کونے پر ایک بڑی سی کوٹھی بنوالی سابقہ والوں سے ذرا بچ کر ہے۔ اسباب جو کچھ بھی ہوں لکھتے خوب ہیں۔ فکر و فہم حضرت تھانویؒ سے لیا اور انداز تحریر مولانا شبلیؒ سے تعلیمات تھانویؒ کو سلسلۂ تجدید دین چار جلدوں میں لکھ کر خوب مقبول بنا دیا ہے۔ اور اب اخیر زمانہ میں اخلاقوں کی زبان سے خدا پرستی کا پیام خوب پھیلایا ہے۔

گراں گوشی تو ہمیشہ رہی (ایک طبی سبب ممکن ہے کہ نیو (لیموں) کا زیادہ استعمال ہو) اور اب کئی برس سے گراں گوشی بہت بڑھ گئی ہے اور اب کئی سال سے عام صحت بھی پھر خراب رہنے لگی ہے۔ اور چلنے پھرنے کے تو جیسے قابل ہی نہ رہے ہیں۔ اس پر بھی لکھنے کا کام خوب کئے جاتے ہیں۔ افسوس ہے کہ اس پر حضرت تھانویؒ کے زمانہ میں توجہ نہ کی۔ ورنہ وہ بڑی مدد فرماتے۔ میں اپنی تحریروں میں ان کا اکثر ذکر ——— "ایک تھانوی الفکر اور شبلی القلم" کے عنوان سے کرتا ہوں۔ اپنی جوانی میں ایک رسالہ "مذہب و عقلیات" پر بہ قامت کہتر بقیمت بہتر بہت خوب لکھا تھا۔ پھر اس کے بعد جیسے لکھنا بھول ہی بیٹھے تھے۔

حضرت تھانویؒ کو اس کی حسرت ہی رہ گئی۔ اب ان کی وفات کے بعد گویا بڑی حد تک تلافی مافات کر دکھائی۔ خدمت دین کے لئے اللہ ان کی زندگی میں زیادہ سے زیادہ برکت عطا فرمائے۔ ضابطہ سے بیعت تو مولانا حسین احمد صاحب سے تھے۔ لیکن تربیت میری طرح، انہوں نے حضرت تھانویؒ سے پائی۔ اور انہیں نے انہیں خلافت سے اجازت بیعت بھی عطا فرمادی ہے۔

(منقول از مسودہ کتاب معاصرین)

۱؎ سیرۃ کی تالیف کے وقت

مستزاد:

عبدالمجید حسنی

کتاب معاصرین صدق جدید میں قسط وار نکلنا شروع ہوئی اور ابھی مولانا عبدالباری ندوی کی باری آنے بھی پائی تھی کہ وہ مرحوم ہو گئے۔ ۳۰ جنوری جمعہ کی صبح کو وفات پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ نماز جنازہ جمعہ کی نماز کے بعد ندوۃ العلماء کی مسجد میں ایک مجمع عظیم کے ساتھ ہوئی جس میں طلبہ ندوہ کی بڑی تعداد اور اساتذہ شامل تھے۔ نماز جنازہ مولانا ابوالحسن علی ندوی نے پڑھائی اور تدفین ڈالی گنج لکھنؤ کے قدیم قبرستان میں ہوئی۔

بقیہ صفحہ ۱۴

عنوان سے کرتا ہوں"۔

(صدق جدید ۱۳ فروری ۱۹۷۶ء)

مولانا کس پایہ کے عالم و بزرگ تھے اس سلسلہ میں مولانا گیلانی کا اعتراف بڑا اعتراف کہا جا سکتا ہے۔ ایک خط میں علامہ سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:۔ "آپ کو اور مولانا عبدالباری کو دیکھتا ہوں تو شعر یاد آتا ہے ؎

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

اور کیا عرض کروں مولانا عبدالباری کا حال حدود رشک سے آگے نکل گیا ہے۔ اب میرے نزدیک تو وہ اچھے صاحب دل بزرگ ہیں۔ کثر اللہ امثالھم"۔

(مکاتیب گیلانی ص ۳۳)

ایک دوسرے مکتوب میں لکھتے ہیں:۔ "مولانا عبدالباری صاحب کی حالت دن بدن بہت زیادہ قابل رشک ہوتی جا رہی ہے، میں تو ان میں بجز ان ارتقاء کی کیفیت پا رہا ہوں وہ بڑی روح اور بڑے نفس کے آدمی ہیں"۔

(مکاتیب گیلانی ص ۳۵)

مولانا مرحوم کی آخری معرکۃ الآراء تصنیف "مذہب و سائنس" ہے اس میں مولانا نے اس غلط خیال کا ابطال کیا کہ سائنس اور مذہب متصادم ہیں آپ نے ثابت کیا کہ سائنس کا دائرہ کار مذہب سے الگ ہے مذہب میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ سائنس کے کسی نتیجہ یا مفروضہ پر صحیح یا غلط کا حکم لگا سکے، مگر سائنس کے پاس یہ صلاحیت نہیں ہے کیونکہ اس کی بنیاد ناپائیدار مفروضات پر قائم ہے یہ کتاب "مجلس تحقیقات و نشریات دارالعلوم ندوۃ العلماء" سے بڑی آب و تاب کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

افسوس کہ جو جیتی جاگتی شخصیت نصف صدی سے زائد تک دنیا کو اپنے خیالات و نظریات اور اپنی خدمات و کارناموں سے مستفید کرتی رہی، ۳۰ جنوری ۱۹۷۶ء کو اشرف کو پیاری ہو گئی اور اس طرح علم و روحانیت کا فلسفہ و علم کلام کا آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہو گیا۔ واللہ

"موت العالِم موت العالَم"

مولانا عبدالباری ندویؒ

محمد محسن اختر متعلم ندوہ

"اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے"

خدا کی اس نگری میں نہ جانے کتنے لوگوں نے آنکھیں کھولیں اور اس دنیائے فانی میں چند دن عیش وطرب میں زندگی گذار کر اپنے ربِ حقیقی سے جا ملے لیکن اسی کی نگری میں کچھ ایسی بھی اہم اور عظیم ترین ہستیاں ہیں جن کے وصال سے نہ جانے کتنوں کے دل پاش پاش، اور جگر پارہ پارہ ہو جاتے ہیں، ان ہی مشہور ومعروف اور ممتاز ہستیوں میں مولانا عبدالباری ندوی مرحوم بھی تھے

مولانا عبدالباری ندویؒ مادرِ علمی ندوۃ العلماء کے وہ چشم وچراغ اور مایۂ ناز فرزندوں میں تھے جن پر بجا طور سے دار العلوم ندوۃ العلماء کو فخر ہے، مولانا مرحوم کے پدرِ بزرگوار بچپن ہی سے ان کی تعلیم وتربیت کا کافی خیال رکھتے تھے، ابتدائی تعلیم دلانے کے بعد اپنے ہونہار ذہین ومحنتی بچے کو دار العلوم ندوہ میں داخل کرا دیا، اس وقت کون یہ کہہ سکتا تھا یہ چھوٹا بچہ آگے چل کر علم میں اتنا کمال پیدا کرے گا اور اپنی ساری صلاحیتوں وتوانائیوں کو دینِ اسلام کی سربلندی اور ملک وملت کی خدمت کے لئے وقف کر دے گا۔

مولانا عبدالباری ندویؒ کے ایک اعلیٰ مفکر اور ہونہار سپوت بننے کے آثار تعلیمی زمانے ہی سے نمایاں تھے، علامہ شبلیؒ کی دوربین اور ادا شناس نگاہ نے بھی اسے بھانپ لیا تھا کہ اگر اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کیا جائے اور اس کی رہنمائی کی جائے تو آئندہ ان سے امت کی توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں، چنانچہ علامہ شبلیؒ کا یہ اندازہ صحیح ثابت ہوا۔

علامہ شبلیؒ نے مولانا کی ذہانت اور ذوق وشوق دیکھ کر مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے پروفیسر کے نام ایک خط لکھا کہ عبدالباری ایک ذہین اور ہونہار لڑکا ہے مزید علمی تحقیق وجستجو کے لئے جا رہا ہے اس کی ہر طرح کی رہنمائی کریں لیکن افسوس کہ بعض وجوہ کی بناء پر یہ آرزو پوری نہ ہو سکی، پھر کچھ دن بعد کشمیر کا سفر کیا اور وہاں بھی علمی تحقیق کا سلسلہ برابر جاری رہا۔

طویل عرصے کے بعد اپنے وطن مالوف لوٹ آئے، مولانا عبدالباری ندوی کا خاص موضوع فلسفہ، تاریخ وسائنس تھا، ہندوستان نے متعدد فلسفی پیدا کئے لیکن سمندر کی گہرائی سے موتی نکالنے والا فلسفی سوائے مولانا عبدالباری ندوی کے کسی کو نہیں پیدا کیا، مولانا کی تصانیف میں دنیا عقلیات پر ایک جامع کتاب ہے، بقول مولانا

حبیب الرحمٰن خاں شروانیؒ کہ فلسفۂ عبدالباری ندوی کے ہاتھ پکڑ کر توحید پڑھ کر ایمان لے آیا۔

اخیر عمر میں مولانا اشرف علی تھانویؒ سے بیعت ہو گئے، خود پیر ومرشد نے بھی مولانا کی صلاحیت کا اعتراف کیا ہے۔ مولانا طویل مدت سے صاحبِ فراش تھے، دار العلوم کے طلبہ برابر مولانا کی خدمت میں جاتے رہتے، بالآخر کئی سال کی پیہم اور سخت علالت کے بعد ۳۰ جنوری ۷۶ء بروز جمعہ چل بسے مولانا کی وصیت کے بعد مولانا علی میاں ندوی نے نمازِ جنازہ پڑھائی، دو بجے نمازِ جنازہ اٹھا اور یہ جوہرِ گرانمایہ لکھنؤ میں سپردِ خاک کیا گیا، مولانا عبدالماجد دریابادی مدظلہ العالی شدتِ مرض کے باوجود نماز میں شریک ہوئے۔ مولانا عبدالباری ندویؒ کی شخصیت ڈھکی چھپی نہیں بلکہ تمام علمی طبقہ بخوبی واقف ہیں۔

مولانا مرحوم جہاں ایک طرف علم وتحقیق، زبان وادب اور شعر وسخن کے شیدائی تھے تو دوسری جانب شریعتِ اسلامی پر عمل، عقائد وعبادات اور تعلق مع اللہ میں پوری طرح سلفِ صالحین کے مقلد ومتبع تھے، مولانا مرحوم اپنے استادِ محترم علامہ شبلیؒ کے آخری مایۂ ناز شاگرد تھے لیکن اب علامہ شبلیؒ کا یہ آخری شاگردِ رشید بھی ہم سے رخصت ہو گیا، غالب نے کیا ہی خوب کہا ہے ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

جس طرح ہم نے نواب محسن الملک کی وفات پر تدبر وسیاست کا ماتم کیا اور مولانا نذیر احمد کے کوچ کرنے پر نثر نگاری اور رزم آرائی کا مرثیہ پڑھا، مولانا شبلیؒ، سید سلیمان ندویؒ کی موت پر ہم نے علم کے فقدان پر نوحہ کیا، مولانا حالی کو رخصت کرتے ہوئے ہم نے سخنوری، دقیقہ سنجی پر ناز کیا، نواب وقار الملک کی رحلت پر ہم نے قوم کا ماتم کیا، لیکن مولانا عبدالباری ندویؒ کے وصال پر ہم فلسفہ اور تاریخ وسائنس کا ماتم کر رہے ہیں اور مولانا مرحوم کے اعلیٰ نمونۂ اخلاق وکردار کی گمشدگی پر نوحہ سنج ہیں۔

مولانا مرحوم کے تحقیقی شہ پاروں میں حسبِ ذیل تصانیف قابلِ ذکر ہیں، مذہب وعقلیات، مبادیِ علمِ انسانی، برکلے، علمِ اخلاق، مدرسۂ تشریح، مقدمہ مابعد الطبیعات، اخلاقیات، طرقِ تعلیمات، فلسفۂ تاثیت، فہمِ انسانی، ملی باقیات، تجدیدِ تصوف وسلوک، جامع المجددین، تعلیم وتبلیغ، تجدیدِ معاشیات، تیز نظامِ صلاح وفلاح، مذہب وسائنس، مطالبِ بخاری

مادرِ علمی کی خدمت میں عقیدت کے چند پھول

از: ————— سید غیاث الدین بکٹہ نگرامی ندوی (ایم۔ اے)

السّلام اے بزمِ رحمانی کی زندہ یادگار
السّلام اے فیضِ عام رحمتِ پروردگار
السّلام اے تجھ سے قائم ملک وملت کا وقار
السّلام اے جانِ گلشن، جانِ گُل، جانِ بہار

فضلِ رحمانیؒ ہے تو بزمِ سلیمانیؒ ہے تو
روحِ مونگیریؒ ہے جانِ شبلی نعمانیؒ ہے تو
درسگاہِ حق ہے یعنی شمعِ نورانی ہے تو
اہلِ حق کے واسطے تصویرِ حقّانی ہے تو

تو امامِ دین لطف اللہ کی آواز ہے
اور حبیبِ شیروانی تیرا اک دمساز ہے
اتحادِ ملتِ بیضا ترا اعجاز ہے
فخرِ ہندوستاں ہے تو ملت کو تجھ پر ناز ہے

تجھ سے روشن ہیں جہاں میں علم وحکمت کے چراغ
تیرا ہر فرزند ہے عالی ہمم، روشن دماغ
تیرے سائے میں ملا جنکو حقائق کا سراغ
آج ان کے ہاتھ میں ہے دین ودانش کا اباغ

یہ دعا دل سے نکلتی ہے چمن باقی رہے
ہند میں دینِ ہدیٰ کا یہ وطن باقی رہے
شبلیؒ مونگیریؒ کی یارب انجمن باقی رہے
اور علیِؒ باصفا سایہ فگن باقی رہے

صدر یار جنگ

(یعنی نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کی سوانح حیات)

جس میں

ان کا خاندانی تعارف ان کے حالاتِ زندگی خصوصیات وکمالات علمی وادبی خدمات تصنیفات مختلف علمی ودینی تحریکات میں ان کا حصہ اور ضمناً ان تحریکوں اور اداروں کا ضروری تعارف بھی آگیا ہے، اور اس طرح یہ کتاب ایک پورے دور کی تاریخ بن گئی ہے ۔۔۔!

NADWA BOOK DEPOT
P. O Box 93, LUCKNOW.

دار العلوم انوار الاسلام

ہندوستان کی پہلی اسلامی درسگاہ عورتوں کے لئے

از: ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ صدر شعبۂ عربی، کالی کٹ یونیورسٹی (کیرالہ)

ہندوستان میں مسلمان بچوں کے لئے عربی کے ہزاروں مدارس قائم ہیں جہاں سے ہر سال بڑی تعداد میں علماء علومِ اسلامیہ کی تکمیل کر کے فراغت حاصل کرتے ہیں مگر مسلمان بچیوں کے لئے کوئی ایسی درسگاہ نہیں جہاں سے طالبات فارغ التحصیل ہو کر ہماری سوسائٹی کو علومِ دین کی رونق سے منور کر سکیں۔ جب میں مالابار آیا تو یہ دیکھ کر میری مسرت کی انتہا نہ رہی کہ یہاں کالی کٹ شہر سے قریب صرف ۳۰ میل کے فاصلہ پر ایک ایسی اعلیٰ عربی تعلیم کی درسگاہ قائم کی گئی ہے جس میں مسلمان بچیوں کو عربی اور اسلامیات کی اعلیٰ تعلیم عربی زبان میں دی جاتی ہے یعنی ذریعۂ تعلیم عربی ہے۔ اتفاق سے شیخ محمد مولوی صاحب سے میری ملاقات کالی کٹ یونیورسٹی میں ہوئی تو انہوں نے مدرسۂ انوار الاسلام کو دیکھنے کی دعوت دی۔ یہاں کی مقامی رسم کے مطابق اہلِ حدیث علماء کے نام کے آخر میں لفظ مولوی لکھا جاتا ہے اور شافعی علماء کے نام کے آخر میں لفظ "مسلیار" لگایا جاتا ہے۔ یہ عربی درسگاہ جماعت اہلِ حدیث نے قائم کی ہے جو یہاں کی مقامی اصطلاح میں "مجاہدین" کہلاتے ہیں۔ شیخ محمد مولوی صاحب اس علاقہ کے ایک برگزیدہ عالم ہیں، عربی زبان وادب پر اچھی مہارت رکھتے ہیں وہ کالی کٹ یونیورسٹی میں ڈین فیکلٹی آف اورینٹل اسٹڈیز بھی ہیں۔ اور انوار الاسلام کے پرنسپل بھی۔ چنانچہ وہ بحیثیت پرنسپل انوار الاسلام عربی کالج مونگم میں مقیم ہیں۔

ان کی پُر خلوص دعوت پر میں مونگم گیا کیرالہ کشمیر سے کم حسین نہیں، یہاں پہاڑوں اور حسین وادیوں کے لامتناہی سلسلے نظر آتے ہیں اور پھر اس پر ناریل اور سپاری کے بلند وبالا پیڑوں کی بہار گویا سونے پر سہاگہ، ہر طرف جشنِ بہاراں نظر آتا ہے۔ راستہ میں ان دلکش مناظر سے لطف لیتا ہوا مونگم پہونچا۔ بس سے اُتر کر مدرسۂ انوار الاسلام کی طرف چل دیا۔ ایک پہاڑ سے قریب ایک چھوٹی سی کھپریل کی بلڈنگ نظر آئی۔ وہاں پہونچا تو شیخ محمد مولوی اور کے۔ پی ابراہیم مولوی صاحب پہلے سے منتظر تھے۔ دفتر میں کچھ دیر بیٹھا۔ مدرسہ کی عربی کتابوں کا جائزہ لیا پھر تمام کلاسوں کا معائنہ کیا، اس کے بعد جلسہ شروع ہوا۔ مدرسہ میں ۳۰۰ سو لڑکیاں ہیں جن کو علومِ اسلامیہ کی تعلیم عربی زبان میں دی جاتی ہے۔ آٹھ اساتذہ ہیں، اکثر عورتیں ہیں جو عربی زبان ادب اور اسلامی علوم پر مہارت رکھتی ہیں۔ جلسہ میں سب سے پہلے شیخ محمد مولوی صاحب نے میرا تعارف کرایا، پھر میں نے تقریر کی آخر میں ایک طالبہ نے نہایت فصیح وبلیغ عربی میں شکریہ ادا کیا۔ واقعی تعجب ہوتا ہے کہ پورا ماحول مدرسہ میں عربی ہے۔ پردہ کی پابندی ہے مگر چہرہ کا پردہ نہیں۔ لڑکیاں ایک دوپٹہ اوڑھ کر دامن باندھ لیتی ہیں اور سوا چہرہ کے پورا جسم ڈھاک لیتی ہیں۔ عورتیں جو اساتذہ ہیں ان کا پردہ یہ ہے کہ وہ ساری پہنتی ہیں مگر پہلے دوپٹہ سے دامن باندھ کر اس پر ساری سے سر ڈھکتی ہیں گویا خوب اچھی طرح جسم ڈھاک لیتی ہیں، بلاؤز فل آستین۔

اگرچہ شمالی ہند میں عربی زبان کے بڑے بڑے دار العلوم قائم ہیں مگر عورتوں کو عالمات بنانے کے لئے اب تک کچھ نہیں کیا گیا۔ انجمائے جنوب میں یہ ایک انقلابی قدم ہے کہ ایک ایسا "مدرسۃ البنات" قائم کیا گیا ہے جہاں اعلیٰ اسلامی تعلیم کا انتظام ہے اور جس میں عربی زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار دیا گیا ہے۔ طالبات بڑی روانی سے عربی زبان میں گفتگو کرتی ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت تو اس پر ہوئی کہ جو لڑکی عالمہ بن کر نکلتی ہے اس کو ملازمت فوراً مل جاتی ہے۔ اتفاق سے خود مجھے یہ تجربہ ہوا کہ اس مدرسہ میں ۵ اساتذہ کا تقرر ہونا تھا مگر ڈگری کے لحاظ سے قابلِ تقرر صرف ایک استاذ مل سکا۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ تمام طالبات کو ملازمت مل جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کیرالہ ہندوستان کی پہلی اسٹیٹ ہے جہاں عربی زبان کی تعلیم پہلی کلاس سے دی جاتی ہے یعنی ملیالم اور عربی دونوں کا آغاز ایک ساتھ ہوتا ہے لہٰذا تعلیم کے لئے اساتذہ کی بڑی درکار ہوتی ہے چنانچہ عام خیال یہ ہے کہ یہاں کم از کم ۵ ہزار عربی اساتذہ موجود ہیں جنھوں نے ایک انجمن "اتحاد معلمی اللغۃ العربیۃ" بھی قائم کی ہے۔

فی الحال یہ مدرسہ ایک کرایہ کی عمارت میں قائم ہے، مسجد کے طور پر ایک کمرہ استعمال ہوتا ہے مگر وہ اتنا چھوٹا ہے کہ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ ۵۰ بار باری باری سے یہاں نماز کے لئے جاتی ہیں۔

عام طور سے مذہبی طبقہ عورتوں کی تعلیم کی مخالفت کرتا ہے مگر اب حالات کی مجبوری سے سب ہی تعلیم کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں، مسلمانوں میں عورتوں کی تعلیم کا بہت کم رواج ہے خصوصاً ان علاقوں میں۔ علامہ اقبالؒ نے سوچا تھا کہ وہ ایک مسلم یونیورسٹی مسلمان بچیوں کے لئے قائم کریں گے۔ اگرچہ اللہ کو منظور نہ تھا کہ اس کا موقعہ دیا مگر یہ پہلو واقعی نہایت اہم ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ بڑے بڑے عربی مدارس کو ایک مدرسۃ البنات بھی کھولنا چاہیئے اس لئے کہ اگر عورتیں علمِ دین کی حفاظت حاصل کر لیں گی تو واقعی اس کے اثرات بڑے دور رس ثابت ہوں گے۔

انوار الاسلام کی شکل میں ایک عظیم دلکش خواب کی تعبیر ظاہر ہوئی ہے اور لطف یہ ہے کہ اس کو یہاں کے علماء نے قائم کیا ہے۔ بے شک زمانہ ایسا آگیا ہے کہ خوابِ غفلت فنا کے مترادف ہے، چنانچہ عورتوں میں اعلیٰ عربی واسلامی تعلیم پھیلانے کا وقت کا سب سے بڑا تقاضہ ہے۔ تاکہ آئندہ نسلیں اپنی تہذیب اور اپنے مذہب کا احساس کر سکیں۔ اگرچہ ابھی اس مدرسہ کی عمر کل چھ برس ہے جس میں ۸ اساتذہ اور ۲۵۰ یا ۳۰۰ طالبات ہیں مگر انشاء اللہ یہ مدرسہ ترقی کرے گا۔ سے بچا تھوڑا کا سکانہ ہے یہی چھوٹا سا پیمانہ اسی سے اندازِ گنبدِ مینا سمجھتے ہیں۔

مدرسہ کے لئے ایک وسیع قطعۂ اراضی خرید لیا گیا ہے جو حسنِ فطرت کے لحاظ سے بھی دلکش ہے۔ مدرسہ کی اصل عمارت وہاں بن رہی ہے کیرالہ کا ایک گھر ہے کہ اس کو بطور دار الاقامہ کے استعمال کیا جا رہا ہے۔ ہوسٹل میں بہت کم لڑکیاں رہتی ہیں، سب آس پاس کے علاقوں سے آتی ہیں اور شام کو اپنے گھر چلی جاتی ہیں۔ غرض پورا دن اس اسلامی فضا میں گذار کر دل بہت خوش ہوا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ہماری سوسائٹی نے مغربی طرح ہماری بچیوں کو مغربی تعلیم حاصل کرنے پر مجبور کر دیا ہے، جو لوگ اس تعلیم اور اس کے اثرات کو ناپسند کرتے ہیں مجبوراً اسی طرف لے جاتے ہیں کہ اس کا نعم البدل موجود نہیں۔ مبارک ہیں وہ بزرگ جنھوں نے اتنا بڑا کام کر دیا اور مسلم معاشرہ میں "عالمات" کے وجود کو ممکن بنا دیا۔ خدا کرے یہ آغاز نیک ثابت ہو اور ہندوستان میں ایسی عربی درسگاہیں کثرت سے قائم ہوں جہاں سے ایسی عورتیں فارغ التحصیل ہو کر نکلیں جن کے کردار میں حضرت فاطمہؓ کی بلندی اور جن کے علم میں حضرت عائشہؓ کی گہرائی موجود ہو ؎

"دا تا آباد رکھے ساقی تری محفل کو"

مولانا سید ابو الحسن علی ندوی کی
نئی تصانیف

جب ایمان کی بہار آئی: رائے بریلی کی تربیت گاہ سے بالاکوٹ کی شہادت گاہ تک ایمان ویقین، اسلامی اخلاق اور جہاد وقربانی کی روح پرور داستان۔ شروع میں سید احمد شہیدؒ کی سیرت کا مختصر خلاصہ، اسکے بعد منتخب اور اثر انگیز واقعات، اعلیٰ کتابت وطباعت دیدہ زیب سرورق
قیمت: بارہ روپے

پرانے چراغ: ملی زندگی کے مختلف شعبوں کے چند مشاہیر اور اربابِ علم ودانش کے حالات وسوانح اور کارناموں کا ایک دلآویز ودلکش قلمی مرقع جس کو پڑھ کر روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔
قیمت: سولہ روپے

تعدّدِ ازدواج: اس اہم مسئلہ پر ایک عرب فاضل شیخ عبدالعزیز القاسمی کی بحث قرآن حکیم اور عقلِ سلیم کی روشنی میں۔ قیمت صرف ایک روپیہ ۵۰ پیسے۔ انگریزی دو روپے

ذکرِ خیر: مولانا ندوی کی والدہ ماجدہ کے مؤثر حالاتِ زندگی جو سب کے لئے یکساں مفید وسبق آموز ہیں۔ قیمت صرف تین روپے

مکتبۂ فردوس مکارم نگر (برولیا) لکھنؤ ۳

مسعیٰ

از مولانا ہاشم میاں فرنگی محلی

ھمارے ملک سے ہزاروں میل دور جانے والے ہمارے بھائیو! سب سے پہلے ہم آپ کی خدمت میں صمیم قلب سے سلام عرض کرتے ہیں۔ ہم وہی سلام عرض کرتے ہیں جو اس سرزمین پر جہاں آپ تشریف فرما ہیں عالم انسانیت کو پہلی مرتبہ بتایا گیا تھا۔ آپ متوجہ ہو جائیے تو خطاب کرنے والا اپنی طرف سے اور ملک کے ساتھ کروڑوں باشندوں کی طرف سے "السلام علیکم" عرض کرتا ہے۔

ہماری اپنی زبان میں اس فقرے کا ترجمہ یہ ہوا کہ ہم اللہ تعالیٰ سے دعاگو رہے ہیں کہ آپ سلامت رہیں آپ کی صحت سلامت رہے، آپ کا ایمان سلامت رہے جب تک آپ کا قیام دیار ابراہیمی میں رہے آپ سلامتی کے ساتھ رہیں پھر سلامتی کے ساتھ اپنے بال بچوں میں واپس تشریف لائیں اور سب کو سلامتی سے پائیں۔

اس سلام میں عجیب و غریب لطیف دلکشی و خوشبو مضمر ہے جو صرف اس سلام کو بتانے والے سلام اللہ علیہ کی جناب میں موجود ہے بلکہ ان کے چاہنے والے پروردگار کو بھی بہت پسند ہے۔

لیجئے جواب سلام تو آپ پر واجب ہی ہو گیا وہاں سے آپ بھی جواب دیں گے جہاں ہر دعا قبول ہوتی ہے، حاضری دینے والے کی ہر بات سنی جاتی ہے، مقرب بندوں کی ہر بات مانی جاتی ہے ہم کو صرف آپ کے عملی جواب کا انتظار ہے آپ جب یہ فرمائیں گے کہ "وعلیکم السلام" تو ہم کو یہ اطمینان حاصل ہو جائے گا کہ ہمارا ایمان سلامت رہے گا اور ہم قیامت میں اللہ کے حضور اسی سلامتی کے ساتھ پیش ہوں گے۔

شکریہ حضور آپ کا بڑا کام کر دیا

مسعیٰ یعنی سعی کرنے کی جگہ جہاں اس وقت آپ حاضر ہیں اس جگہ کو سلامتی سے خاص مناسبت ہے اس متبرک مقام پر پہلے دن نہ صرف سلامتی کی دعا مانگی گئی تھی بلکہ سلامتی طلب کرنے کے لئے عجب وعمل کو پیش کیا گیا تھا اور اس کا عملی مظاہرہ بھی کیا گیا تھا، سلامتی کے حصول کے سلسلے میں جو سعی کی گئی تھی وہ اللہ تعالیٰ کو اتنی پسند آگئی تھی کہ اب رہتی دنیا تک اللہ کو راضی کرنے والے یہاں آکر ویسی ہی سعی کریں گے۔ تلاش و جستجو اسی انداز سے ہوگی جیسے پہلے دن ہوئی تھی دوڑ دھوپ بھی اتنی ہی کی جائے گی۔ نظروں اٹھا کر بار بار دیکھا بھی جائے گا کہ دعا باب قبولیت تک پہنچی، دیئے کو بار بار اونچا بھی اٹھایا جائے گا کہ مقصد بہت بلند ہو گا۔ کوتاہ دست خریدار اسے میں دہلائے جاتے ہیں، یہاں تو جو آجاتا ہے اس کو عام آدمیوں سے بلند و بالا بنا دیا

جاتا ہے پھر اس کو حکم دیا جاتا ہے کہ ہمیشہ ہمیش کے لئے اب پستی سے کنارہ کش ہو جاؤ اب جو کچھ بھی تم مانگو دینے والے کی رفعت شان کا اندازہ کر کے مانگو۔ آسمانوں کا مالک تم کو نہ صرف عنایت فرمائے گا بلکہ اپنے سے قریب کرے گا اس کی قربت کے تصور سے ہی ہر پستی خود بخود کنارہ کشی اختیار کرے گی گویا کہ وہ چھٹ کر چلی جائے گی اب آپ ہیں اور اللہ کی عنایت کی ہری بلندیاں۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جہاں آپ اس وقت حاضر ہیں اس پورے خطے کو آقائے دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے جد امجد حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے پوری نسبت حاصل ہے اس بے آب و برگ و گیاہ سخت اور پتھریلے علاقہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے جناب ابراہیم ان کی اہلیہ محترمہ جناب ہاجرہ اور ان دونوں کے پیارے فرزند حضرت اسمٰعیل کا مسکن تجویز فرمایا تھا نہ یہاں کوئی آبادی تھی نہ کوئی مکان، نہ کوئی مونس تھا نہ غمخوار، انتہا یہ ہے کہ اگر بات کی جائے تو کوئی جواب بھی دینے والا نہیں تھا گویا یہاں رہنے والوں کو پہلے دن یہ بتا دیا گیا تھا کہ یہاں ہم ہی ہم ہیں بس ہمیں کو پیش نظر رکھو ہمیں سے طلب کرو اور ہماری عنایت کا انتظار کرو۔ ہمارے علاوہ نہ کوئی بات سننے والا ہے نہ غرض پوری کرنے والا ہے۔

حضرت ابراہیم علی نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نہ اس دیار کے رہنے والے نہ یہاں کی جغرافیہ سے واقف بس حکم ملا اور تعمیل کے لئے اہل و عیال کے ساتھ حاضر ہو گئے۔ نہ اپنی خوشی سے گھر کو چھوڑا نہ اپنے ارادے سے اس سرزمین کو آباد کیا گھر سے چلے تھے تو ایک بی بی حضرت سارہ ساتھ تھیں ملک مصر پہونچے تو اللہ نے دوبارہ گھر بسا دیا حضرت ہاجرہ کے لئے گویا ہمارے ہاں ان کے باپ جو بادشاہ مصر بھی تھے ایک مناسب بر کی تلاش میں تھے سسر داماد کے لئے چشم براہ تھے مگر ابراہیم علیہ السلام تو اللہ کے منظور نظر تھے ان کی نگاہ میں سسرال کا عیش و آرام کیا آتا، ایک آنکھ بھی نہ جایا۔ دل کی آنکھ جس کو دیکھا کرتی تھی اسی کا حکم پیش نظر تھا رہنے کو تو کچھ دنوں حضرت ہاجرہ سے نکاح کرنے کے بعد ملک مصر میں رہے مگر جو وطن ان کا اور ان کے اہل و عیال کا بنا دیا گیا تھا اس کی کشش ہر وقت دامن کش رہتی جس سسرال میں کچھ عرصے ضرور قیام رہا اپنے شوہر سے بے پناہ محبت فرمانے والی بی بی حضرت ہاجرہ شاہی محل چھوڑ کر اپنے

فرزند حضرت اسمٰعیل کو لے کر شوہر نامدار کے ساتھ توکلت علی اللہ کہہ کر روانہ ہو گئیں۔ حضرت ابراہیم کو متعین منزل بتا دی گئی تھی۔ تین متبرک نفوس کا یہ قافلہ منزل بمنزل صعوبات سفر برداشت کرتا ہوا اس وادی غیر ذی زرع میں پہونچا۔ ابراہیم علیہ السلام ابھی پورے طور پر سفر کا تکان بھی دور نہ کر پائے تھے کہ پھر حکم ہوا کہ اپنی بی بی اور بچے کو اسی جگہ ہماری حفاظت و نگرانی میں چھوڑ کر واپس چلے جاؤ۔ واللہ خیر حافظا وھو ارحم الراحمین۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام ساتھ کی پکی پکی کچھ روٹیاں اور ایک مشکیزہ پانی کا اپنے اہل و عیال کے لئے چھوڑ کر اللہ کے حکم سے واپس چلے جاتے ہیں ماں بچے اطمینان سے رہتے ہیں کھانا پانی رفتہ رفتہ ان کا ساتھ چھوڑ رہے ہیں، نہ یہاں کوئی بازار ہے جہاں سے ہر روٹی تو ختم ہو چکی تھی تسلی یہ تھی کہ پانی موجود ہے اب پانی بھی ختم ہو گیا۔ دونوں سہارے اللہ نے ختم کر دئے، محبت کرنے والی ماں اپنی آغوش شفقت میں لے کر بلکتے فرزند کو بار بار تسلی دے رہی ہیں مگر پیاس کسی تسلی کو قبول نہیں کرتی ہے جب اس طفل تسلی سے کام نہ بنا تو حضرت ہاجرہ دائیں بائیں پانی تلاش کرتی ہیں جیتیل میدان میں جب پانی کہیں نظر نہ آیا تو پہاڑ پر چڑھ گئیں، ایک پہاڑ پر چڑھیں تو حد نگاہ تک کہیں پانی کا نام و نشان نہیں ملا دوڑ کر سامنے والے پہاڑ پر پہونچ گئیں کہ شاید اس پہاڑ سے کوئی چشمہ یا تالاب یا کنواں نظر آجائے پھر وہاں پہونچ کر کچھ پانی حاصل کیا جائے اور اپنے لخت جگر کے حلق کو تر کرنے کا سامان کیا جائے۔

ہاجرہ بی بی جب تک دونوں پہاڑیوں پر پانی تلاش کرتی رہیں تو ایک آنکھ پانی تلاش کرتی تو دوسری آنکھ اپنے نور نظر پر رہتی کہ کوئی ان پر نظر نہ ڈالے۔ پہاڑ پر سے اتر آئیں اب سطح زمین پر پہنچیں تو پانی تو نظروں سے غائب ہی تھا نور چشم بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔ اب کیا کریں کبھی کاندھوں کو بلند کر کے اپنے فرزند کو دیکھنے کی کوشش کرتیں تو کبھی اپنے پنجوں پر کھڑے ہو کر دوڑتے ہوئے اپنے فرزند کی جھلک دیکھنے کی سعی کرتیں مگر تلاش سے مقصود پورا نہ ہوا تھک جاتیں تو میانہ روی سے چلتیں ہمت واپس آجاتی تو پھر تیز چلنے لگتیں۔

ایک پہاڑ سے دوسرے پہاڑ تک سات چکر پورے کر لیتی ہیں اور اسی شان کے ساتھ عزم و ہمت میں کوئی کمی نہیں ہوتی اگرچہ پاؤں شل ہو چکے ہیں۔ یہ سات پھیرے تو گردش تقدیر سے ہو گئے اب حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مقدر کو ملاحظہ کریں کو زمین پر پڑے پڑے پیاس کی شدت میں اپنی ایڑیاں رگڑ رہے ہیں مقدر بنانے والے نے ان ایڑیوں میں اپنی قوت، طاقت عنایت فرما دی کہ طاقت ور سے طاقت ور اور زور آور بھی وہ کام نہیں کر سکتے تھے۔ جناب اسمٰعیل کی ایڑیاں اللہ کے حکم سے اپنے لئے زمزم کا آب فراہم کر رہی تھیں۔ ننھے ننھے

جوڑے کی یہ جد و جہد بھی اللہ کو اتنی پسند آگئی کہ ماں کے آنے کے پیشتر ہی ایک چشمہ جناب اسمٰعیل کی ایڑیوں کے پاس جاری ہو گیا۔

جناب ہاجرہ جب دونوں پہاڑوں کے درمیان دوڑ دھوپ سے اور پہاڑوں پر چڑھ جانے کی مشقت سے فرصت پاتی ہیں تو اپنے فرزند کے پاس آتی ہیں تو اپنے فرزند کو آرام پاکر اپنی آنکھ میں ٹھنڈک محسوس کرتی ہیں پھر چشمہ کو دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ چشمہ کی روانی کو منڈیریں بنا بنا کر مقید و پابند کرنے لگتی ہیں۔

حضرت بی بی ہاجرہ کی دونوں پہاڑیوں کے درمیان دوڑ دھوپ اللہ تعالیٰ کو اتنی پسند آگئی کہ اب رہتی دنیا تک ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان رحمت حق کو تلاش کرنے والے اسی تگ و دو میں رہیں گے۔

آپ بھی جی لگا کر ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان مرحمت و مغفرت حق کی تلاش میں سعی کیجئے۔ اللہ آپ کو کامیاب فرمائے گا اور آپ سرخرو ہوں گے۔

(ریڈیائی تقریر)

حقوق والدین

اطاعت کا انمول نمونہ

کتاب و سنت

اور واقعات کی روشنی میں

از: محمد کاظم ندوی

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ دار العلوم فاروقیہ کاکوری لکھنؤ

(۲) مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء۔ لکھنؤ

اکبر

دور حاضر کی بہترین گھریلو دوا

نورانی تیل

ہر قسم کے جسم کے درد چوٹ۔ زخم۔ جلنے کٹنے کی بہترین دوا

جعلی ٹریڈ مارک اور لیبل کے ٹھگی سے ہوشیار رہیں۔

انڈین میڈیکل کمپنی۔ مئوناتھ بھنجن (یو۔پی)

لبنانی مسلمانوں کی صورت حال پر ایک نظر

از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی

اب وقت آگیا ہے کہ ہم لبنانی مسلمانوں کی سیاسی اور اجتماعی صورت حال پر ایک نظر ڈالیں یہ ایک پیچیدہ اور مخصوص صورت حال ہے، جس کا اندازہ دوسرے ملکوں کے باخبر سیاستدان بھی آسانی سے نہیں لگا سکتے۔ جس شخص نے لبنان کا دورہ نہ کیا ہو اور وہاں کے حالات پر دقت نظر سے غور کرنے کا موقع اس کو نہ ملا ہو تو وہ اس صورت حال کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکتا۔

مختصر یہ کہ لبنان کے مسلمان دولت عثمانیہ کے خلاف عربوں خصوصاً شامیوں کی بغاوت انگریزوں کے وعدوں پر اعتماد، اور خلافت عثمانیہ کے دائرہ سے خروج کی سزا اور نحوست سے ابھی تک عہدہ برآ نہیں ہو سکے ہیں، وہ خلافت عثمانیہ جو اپنی تمام غلطیوں، کوتاہیوں اور کمزوریوں کے باوجود اسلامی قوت اور اسلامی اتحاد کا نشان اور مقامات مقدسہ کی محافظ تھی غالباً اس تاوان میں جو عربوں کو ادا کرنا پڑ رہا ہے، اور آج بھی ادا کر رہے ہیں لبنان کے مسلمانوں کا حصہ شام کے دوسرے باشندوں سے زیادہ ہے، لبنانی مسلمان آج بھی اس پیچیدہ مخصوص اور نرالی صورت حال کے دباؤ سے کراہ رہا ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جبل لبنان میں عیسائیوں کی اکثریت تھی، اس کے برخلاف ساحل اور بقاع میں مسلمان اکثریت میں تھے، پھر سنہ ۱۹۲۰ء میں بیروت، صیدا، بعلبک، بقاع، حاصبیا اور راشیا کا لبنان سے الحاق عمل میں آیا اور جبل لبنان کو نئی جمہوریہ کی اساس و بنیاد قرار دیا گیا، سنہ ۱۹۳۲ء میں فرانسیسی حکومت نے مردم شماری کرائی جو اوائل جنوری ۱۹۳۲ء کو عمل میں آئی۔ اس مردم شماری کے پیچھے سیاسی اغراض کار فرما تھے، دراصل فرانس کا مقصد یہ تھا کہ ملک کے باشندوں کی تعداد میں ایک فرقہ کو دوسرے پر فوقیت دے دی جائے، اسی کے ساتھ ساتھ ایک افواہ یہ بھی پھیل گئی کہ فرانس کا مقصد اپنی نوآبادیات میں فرانسیسی فوج میں جنگ کے لئے جبری بھرتی ہے اور مسلمان اس سے بچتے تھے مسئلہ کی پیچیدگی میں اس سے اور اضافہ ہو گیا کہ وہ سوریا کی تقسیم کے مخالف تھے۔

ان تمام اسباب کی بنا پر مسلمانوں نے مردم شماری سے کلی فرار اختیار کیا، نتیجہ ظاہر تھا، چنانچہ اس پر فریب مردم شماری سے عیسائیوں کی اکثریت ثابت ہو گئی، لبنان کے اعلیٰ حکام نے دوسری صحیح اور مکمل مردم شماری کرانے سے انکار کر دیا، اور آج بھی اس کے لئے آمادہ نہیں ہیں، جب کہ پہلی مردم شماری پر چالیس برس سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے۔

اسی مردم شماری کی بنیاد پر قومی دستور مرتب کیا گیا، عہدوں اور پارلیمنٹ کی نشستوں کی تقسیم انجام پائی اور یہیں سے اس عرب اسلامی ملک میں مسلمانوں کی حیثیت اور مستقبل کا تعین ہوا اور وہ یہ کہ مسلمان تعداد میں اکثریت کے باوجود اپنے وطن میں اقلیت کی حیثیت سے زندگی گزاریں گے، معاملہ کی سنگینی اس سے اور بڑھ جاتی ہے کہ غیر مسلموں کو لبنانی قومیت پوری فیاضی سے دی جا رہی ہے اور اس طرح ان کے سیاسی مستقبل کا تحفظ کیا جا رہا ہے۔

فرانس جب لبنان کو چھوڑ رہا تھا تو اس نے حکومت مارونی فرقہ کے سپرد کی اور ایک ایسا دستور (CONSTITUTION) وضع کیا گیا، جس کے رو سے ساری طاقت صدر جمہوریہ کے قبضہ میں ہوتی ہے، اور وہ ہمیشہ عیسائی ہوتا ہے، اس کو سب سے زیادہ اختیارات دئے گئے ہیں اور وہ کسی کے آگے جوابدہ نہیں ہوتا، اور وزیر اعظم کو جس کے متعلق دستور میں ہے کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں میں سے منتخب کیا جائیگا، صدر جمہوریہ ہی مقرر کرتا ہے۔ وزیر اعظم پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے اور پارلیمنٹ جب چاہے اس کے خلاف اور اس کے وزراء کے خلاف .... عدم اعتماد کی تجویز پاس کر سکتی ہے، وزیر اعظم کے پاس مخصوص اختیارات بھی کچھ نہیں ہوتے، حقیقت یہ ہے کہ وہ صدر جمہوریہ کا ہیڈ کلرک ہوتا ہے اگرچہ عملی طور پر "عزت مآب" صدر جمہوریہ کا محافظ اور ڈھال ہوتا ہے۔

یہ تو وہ دستور ہے، جو تحریری شکل میں ہے اور جو لبنانی مسلمانوں کے ساتھ پورا انصاف نہیں کرتا، اس کے علاوہ وہاں ایک اور دستور بھی ہے جو کہیں تحریری شکل میں نہیں ہے، وہ ہے وہ طریقہ جس کو لبنانی جمہوریہ اپنائے ہوئے ہے، ان دونوں دستوروں میں نمایاں تضاد پایا جاتا ہے، چنانچہ کلیدی عہدوں پر غیر مسلموں کی اجارہ داری ہے۔ ترقیاتی پروگراموں، مدارس، ادارے اور رفاہی وغیرہ کے مستحق صرف غیر مسلم علاقے ہوتے ہیں، اخراجات و اقتدار سے اخوان اور کمیان سول کوڈ کی دعوت مزید برآں جس کی اس ملک کی زندگی میں بہت اہمیت ہے، تعطیل کے ایام حکومت نے جمعہ کے بجائے سنیچر اور اتوار کو مقرر کیا ہے۔ حکومت کی ملازمتیں یہی ہے کہ ملازمت کی بنیاد فرقہ وارانہ ہو، اور سب کچھ ایک مکمل و مرتب اسکیم کے ماتحت تھا، ان اسلامی علاقوں کو جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں ترقی کے مواقع سے محروم رکھا جاتا ہے، اسی طرح جن مسلمانوں نے کسی وجہ سے لبنان چھوڑ دیا تھا ان کو لبنانی قومیت حاصل کرنے میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

بلاشبہ اس صورت حال کی ذمہ داری لبنانی مسلمانوں پر بھی ہے، اور بہت سی چیزوں کا تعلق ان کی کوتاہ بینی اور حالات کا صحیح اندازہ نہ لگانے سے ہے کیونکہ لبنان کے سارے حالات غیر مسلموں کی جانب سے سوچی سمجھی اسکیم کے مطابق رونما ہوئے اس کے برعکس مسلمانوں نے اس سلسلہ میں کسی منصوبہ بندی سے کام نہیں لیا، ایک سبب مسلم پارٹیوں کے لیڈروں کی انانیت اور سیاسی رہنماؤں کی خود غرضی اور نفس پرستی بھی ہے، جو ہر قیمت پر وزارت عظمیٰ کے عہدہ کو قبول کرتے رہے، خواہ اس سلسلہ میں لبنان کے مسلمانوں کے ساتھ مفادات اور ان کے فطری اور شہری حقوق کا مطالبہ نہیں کیا، اور بعض اوقات وزارت عظمیٰ کے عہدہ کو قبول کرنے کے لئے "عزت مآب صدر" کی دعوت پر فوراً لبیک کہا خواہ اس کی مدت چند ہفتوں اور چند دنوں سے زیادہ نہ ہو۔

اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہنا چاہیے کہ لبنان کے مسلمان عرب حکومتوں اور عرب دنیا سے بالکل علیحدہ اور الگ تھلگ رہتے ہیں، ان کو کسی عرب حکومت سے کوئی تعاون اور اپنے مسائل کے سلسلہ میں کسی قسم کی ہمدردی حاصل نہیں ہوتی، اس کے برخلاف عیسائی فرقہ کو تمام عیسائی یورپی قوتوں، امریکہ اور واشنگٹن سے ہر طرح کا تعاون ملتا ہے، پوری عیسائی دنیا اس کی پشت پناہی کرتی ہے لیکن مسلمانوں کو عرب اور اسلامی دنیا سے کوئی مدد نہیں ملتی بعض حکومتیں اور بعض عرب ممالک کے دولت مند اور اصحاب خیر حضرات کچھ اسلامی اور فلاحی اداروں کے ساتھ تعاون ضرور کرتے ہیں، مگر اس سے لبنانی مسلمانوں کی موجودہ صورت حال اور ان کی آئندہ نسلوں کے مستقبل پر جو اس ملک سے وابستہ ہے کوئی اثر نہیں پڑتا، حالانکہ یہ ملک مغربی، جغرافی اور سیاسی محل وقوع کی بنا پر بہت اہمیت رکھتا ہے، اور عرب ملکوں کے حالات اور مستقبل پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

اوپر کے سطور میں یہ اشارہ گزر چکا ہے کہ غیر مسلم طاقتوں نے لبنان میں مسلم عرب اکثریت کو بے اثر و بے وزن بنانے اور مسیحی فرقہ کو اس علاقہ میں وسائل اقتدار عطا کرنے کے لئے منصوبہ بند طریقہ پر کام کیا اور سب کچھ ایک مکمل و مرتب اسکیم کے ماتحت تھا،

حسن اتفاق سے اس حال میں اس کا ایک دستاویزی ثبوت ملا، یہ ایک رازدارانہ تقریر ہے، جو حکومت فرانس کی طرف سے عیسائی قائدین اور کارکنوں کی رہنمائی کے لئے مخفی طور پر تقسیم کی گئی تھی، یہاں اس کا ترجمہ درج کیا جاتا ہے۔

(یہ اس منشور کا عربی ترجمہ ہے، جو سنہ ۱۹۱۹ء میں اتفاق سے لبنان کے ایک کلیسا میں فرانسیسی زبان میں لکھا ہوا ملا تھا)

"مادر حکومت کی جانب سے اس کے مخلص فرزندوں کے نام،

اے یسوع مسیح کے بچو!

اے وہ محبو! نے اپنے عقائد کے تحفظ اور دفاع کے لئے صدیوں تک ذلت و رسوائی کو برداشت کیا، اے شرفاء اطہار! یہ دس نصیحتیں یاد رکھئے۔

۱۔ یہ وطن آپ ہی کے لئے وجود میں آیا ہے تاکہ آپ اپنا شیرازہ اکٹھا کر سکیں اور تاریخی جنگ کے بعد اپنی آزادی سے متمتع ہو سکیں، آپ کو یقین کرنا چاہیے کہ عیسائی کے معنی لبنانی ہیں اور صحرا سے آنے والے عربوں کو صحرا واپس جانا چاہیے۔

۲۔ ہم نے آپ کے لئے وہ تمام اہم انتظامات کر دئے ہیں، جو اس علاقہ میں آپ کی خوشحال زندگی کے ضامن ہیں، مثلاً ملکیت اراضی، غیر ملکی ایجنسیاں سیاسی صورت حال اور وزراء، اب آپ کا کام یہ ہے کہ ان مفادات کا تحفظ کریں، اور ان میں روز افزوں اضافہ کریں۔

۳۔ تفریح گاہوں اور سیاحتی انتظامات پر قبضہ کرنے کی کوشش کیجئے اور جب آپ اکثریت میں ہو جائیں تو عربوں کو ان کی بستیوں سے نکال دیجئے بیروت کے علاوہ کسی دوسرے شہر میں جہاں مسلمان رہتے ہوں ایک پیر زن کی نگہ کی تعمیر ہرگز نہ بھولئے جس وقت بھی موقع ملے اور حالات ساز گار ہوں اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کیجئے۔

۴۔ طاقت کے تمام ذرائع اختیار کیجئے، مثلاً جسمانی ورزش، اسلحہ اور نوجوانوں کی تنظیمیں، فوج سے دلچسپی لیجئے، اپنی بات پوشیدہ رکھئے اپنے رفقاء پر اعتماد کیجئے، اس لئے کہ دشمنوں کے ساتھ معرکہ بہت طویل اور مسلسل ہے۔

۵۔ اداری قیادت کی زمام اپنے ہاتھ میں لیجئے، مثلاً کتابوں کی اشاعت اور تمام انجمنوں اور کلبوں پر آپ کا قبضہ ہو، ہرگز یہ تسلیم نہ کیجئے کہ آپ کی قوم کا سرمایہ تنہا مسلمانوں کی ملکیت ہے اور ہر کسی دور رعایت کے ان تمام افکار و اشخاص سے جنگ کیجئے جو آپ کے رجحانات کی مخالفت کرتے ہیں۔

۶۔ اپنے باہمی اختلافات کو نظر انداز کر دیجئے اور اٹھ کھڑے ہو جائیے، کیونکہ آپ کی زندگی کا دار و مدار قرآن کے مقابلہ میں آپ کے اتحاد و یکجہتی پر ہے، اور آپ تو اس یسوع کے فرزند ہیں جس نے ہم کو محبت کا درس دیا ہے۔

لدّاف

آندھرا کا ایک نیم مسلم فرقہ

بیگم احتشام ندوی متینا (کمال کٹ بکرالہ)

آندھرا کے ۶ سالہ دوران قیام میں ایک ایک نئے فرقہ کے افراد سے ملنے کا اکثر اتفاق ہوا یہ لوگ اپنے اعمال اور اصولِ حیات کے لحاظ سے تقریباً مسلمان ہیں لیکن وہ مسلمان نہیں بلکہ لدّاف کہے جاتے ہیں اور وہ لوگ خود کو مسلمانوں سے الگ اور مختلف تصور کرتے ہیں۔ یہ لوگ نکاح کرتے ہیں، ختنہ کرتے ہیں، تجہیز و تکفین بھی مسلمانوں کی طرح کرتے ہیں۔ نماز جنازہ خود نہیں پڑھتے لیکن میت کو مسجد میں لاکر مسلمانوں سے جنازے کی نماز پڑھواتے ہیں۔ فاتحہ وغیرہ بھی کرواتے ہیں، لیکن خود روزہ نماز نہیں کرتے۔ ان میں سے بعض مرد نماز پڑھنا بھی جانتے ہیں لیکن عورتیں بالکل نہیں جانتیں۔

یہ لوگ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے تیوہار مناتے ہیں اور اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ہمارے تیوہار دوسری قوموں سے زیادہ ہیں۔ عیدوں کے موقعے پر بطور رسم مسجد جاتے ہیں، اور ہندو تیوہاروں کے موقعے پر مندر بھی جاتے ہیں نیز مزاروں پر منتیں مانتے بھی جاتے ہیں۔

لدّاف عورتیں ہندو عورتوں کی طرح پیشانی پر سیندور کا ٹیکہ نہیں لگاتیں نہ گھر کے سامنے کولم سے نقش و نگار بناتی ہیں جو آندھرا کے ہر ہندو گھر کے باہری دروازے کا جز لازم ہے، یہ لوگ لباس مسلمانوں کا پہنتے ہیں لیکن زبان تیلگو بولتے ہیں جب کہ آندھرا کے مسلمان دکھنی اردو بولتے ہیں نام بھی مسلمانوں کے ہی رکھتے ہیں مثلاً رسول بی، حسین بی، رسول صاحب، یاسین صاحب ایک ہی نام ہیں عورت اور مرد کی تفصیل کے لئے بی یا صاحب لگانے کا رواج آندھرا کے مسلمانوں میں عام ہے۔ لیکن ان کے یہاں عورتوں کو دوسری شادی کی اجازت نہیں ہے۔

ایک لدّاف خاتون میرے پڑوس میں تھیں ان سے میں نے پوچھا کہ تم نماز پڑھتی ہو، تو انہوں نے جواب دیا کہ ہم لدّافوں کو نماز کی کیا ضرورت لیکن میرا شوہر نماز پڑھنا جانتا ہے پھر میں نے پوچھا کہ مندر جاتی ہو تو انہوں نے کہا کہ ہاں، مندر جاتے ہیں لیکن مورتی پر ناریل وغیرہ نہیں چڑھاتے نہ ہاتھ جوڑتے ہیں نہ پوجا کرتے ہیں صرف دور سے دیکھ کر چلے آتے ہیں" یعنی لدّاف بتوں سے بھی الگ نہیں جاتے۔

یہ لوگ تعداد میں دس ہزار یا اس سے کچھ زائد ہوں گے اور آندھرا کے ایک مخصوص علاقہ تک ہی محدود ہیں۔

ان میں زیادہ تر کاشت پیشہ اور محنتی ہیں، کچھ مزدوری پیشہ بھی ہیں۔ یہ لوگ دوسری قوموں کے اثرات بہت قبول کر لیتے ہیں۔

جو لدّاف مسلم اکثریتی علاقہ میں رہتے ہیں ان میں سے اکثر مرد دو یا تین وقت کی نماز پڑھتے ہیں گو کہ وہ اسے ضروری نہیں

بلکہ مندر کو مسجد پر ترجیح دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک صاحب سنسکرت کے طالب علم تھے اور ہندو اکثریتی علاقہ کے رہنے والے تھے ان سے جب کہا گیا کہ آپ کا نام مسلمانوں کا سا ہے اور آپ کے یہاں کے طور طریقے بھی مسلمانوں سے مشابہ

سمجھتے ہیں اس کے علاوہ وہ تمام کام بھی کرتے ہیں جو مسلمانوں کے جاہل اور بدعتی طبقہ میں کئے جاتے ہیں۔ یعنی مزار پرستی، بسم اللہ یا لیسمان وغیرہ کی دعوتیں۔ اور ہر جمعرات کو کسی مولوی صاحب سے فاتحہ دلوا کر شیرینی بچوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

اس کے برعکس جو لدّاف ہندو اکثریتی علاقہ میں رہتے ہیں وہ نماز وغیرہ نہیں پڑھتے

ہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ مسلمانوں سے قریب تر ہیں تو اس کا انہوں نے ناگوار اثر لیا۔ اور فخریہ کہا کہ ہم مندر بھی تو جاتے ہیں، اور دیوالی وغیرہ سب تیوہار مناتے ہیں پھر کیونکر آپ ہمیں مسلمانوں سے قریب تر کہہ سکتے ہیں۔

اس فرقہ کی اس مزاجی کیفیت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود اپنے دو غلے اور نامکمل نظام حیات سے غیر مطمئن اور خیال کے بیگانے والی کیفیت

سے بیزار ہیں اور کسی بڑی نمایاں حیثیت رکھنے والی قوم میں ضم ہو جانا چاہتے ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی وقت میں ایک مخصوص علاقہ کے تمام افراد مسلمان ہو گئے لیکن انھیں مسلمان بنانے والے انھیں مکمل دینی تعلیم دینے اور اصولِ اسلام پوری طرح پڑھانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے آبائی مذہب کے اصول ترک نہیں کئے اور نئے مذہب کے اصول بھی اپنا لئے اس طرح دونوں مذاہب کے عقائد ایک دوسرے سے خلط ملط ہو کر ایک نیا فرقہ وجود میں آگیا۔

ان کی حالت بیچ دریا میں پڑی ہوئی کشتی کی مانند ہے اور کوئی بھی اس کشتی کو پار لگا کر اپنے میں ضم کر سکتا ہے۔

لیکن چونکہ یہ لوگ اصول عبادت کے علاوہ ہر طرح سے مسلمان ہیں بلکہ اصولِ عبادت میں تقریباً نصف مسلمان ہیں اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کی کشتی کو اسلام کے ساحل کی طرف لے آئیں۔

اس کے لئے محنت خلوص اور زبردست تبلیغی صلاحیت کی ضرورت ہے۔

میرا خیال ہے کہ ہماری تبلیغی جماعتیں جو آپس میں ہی تبلیغ کیا کرتی ہیں انھیں دراصل اس طرف توجہ کرنی چاہئے اور اس نیم مسلم قوم کو مکمل مسلمان بنانے کی کوشش کرنی چاہئے۔

اس مسئلہ پر بہت جلد توجہ کرنے کی ضرورت ہے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمیں حسب عادت خواب غفلت سے جاگنے دیر لگے۔ اور دوسری قوم اس طرف توجہ کر کے فائدہ اٹھا لے۔ اور موقع ہاتھ سے جاتا رہے۔

اگر ایسا ہوا تو ہم بہت بڑے خسارے میں رہیں گے اور شاید ہمیں اپنی اس کوتاہ عملی پر خدا کے سامنے جواب دہ بھی ہونا پڑے۔

غزل

آثر ——— (رشید کوثر فاروقی)

ہمارا اُن کا سرِ حشر سامنا ہوگا
یہاں نہ ہوگا تو وعدہ وہاں وفا ہوگا

کچھ اعتبار نہیں اولیں نگاہوں کا
جو عشق دیر میں ہوگا وہ دیرپا ہوگا

کہ اسکی گلی سے یہ سوچتے گزرے
کہ وہ حجاب نشیں ہم کو دیکھتا ہوگا

اکھڑ گیا ہے تو اب راستے کا پتھر ہے
کسی زمانے میں منزل نما رہا ہوگا

سنا ہے خانۂ صیّاد پر گری بجلی
کسی کا آہ کا کانٹا نکل گیا ہوگا

متاعِ ہستیٔ دل سونپ دی، خبر کیا تھی
کہ وہ دوا کی جگہ درد بیچتا ہوگا

کنارِ آب میں موجوں کے دائرے بھی نہیں
مری طرح کوئی کاہے کو ڈوبتا ہوگا

فنا پذیر مُغنّی، نوائیں لافانی
ہمیں حیات سے آگے بھی سوچنا ہوگا

غنی کے در سے جو مایوس ہو کے لوٹ گیا
گدا کے بھیس میں پھرتا ہوا خدا ہوگا

یہ شب گذار جنھیں سائباں نصیب نہیں
انہیں کے ہاتھوں یہ عشرت محل بنا ہوگا

قسم ہے فتحِ قمر کی کہ اُٹھنے والا ہے
قدم جو وسعتِ امکاں کو ناپتا ہوگا

خطر گریز ہے، ساحل کو چھوڑتا ہی نہیں
کسے گماں تھا کہ ایسا بھی ناخدا ہوگا

سکوتِ حسن میں اک رنگِ التفات بھی تھا
وہ مجھ کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تولتا ہوگا

کچھ اٹھیں سی لہو میں ترانہ گاتی ہیں
کوئی ضرور مرے پاس آ رہا ہوگا

مرے نصیب میں طالع نگار نے لکھا
یہ کج کُلاہ، خدا مست و بے نوا ہوگا

> "تعمیرِ حیات"
> کی توسیعِ اشاعت میں حصّہ لیجیے۔

تحریر: الحسن حسن ہینی

تلخیص و ترجمہ: محمد لطف متعلم درجہ ششم عربی

امام شیرازی

بلاشبہ اُمّتِ اسلامیہ کے علماء و دانشور اس قدر ہیں کہ ۱۰۰ اور ہزار کا لفظ اُن کا احاطہ نہیں کر سکتا اُن میں سے اکثر کو اللہ تعالیٰ نے شہرت و عزت عطا فرمائی اور اُن کا تذکرہ تاریخ کے صفحات پر ملتا رہتا ہے اور ملتا رہے گا۔

انہی مشاہیر علماء میں سے امام ابو اسحاق شیرازی ہیں جو اپنی صفات محمودہ، کتب کثیرہ اور اخلاق حمیدہ میں مشہور و معروف ہیں۔ شیخ امام ابراہیم بن علی ابن یوسف، جمال الدین ابو اسحاق فیروزآبادی ثم شیرازی ۳۹۳ھ میں پیدا ہوئے۔ انھیں شیخ اس لئے کہا جاتا ہے کہ خود وہ فرماتے ہیں:

"میں سویا ہوا تھا کہ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ آپ کے ساتھ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ بھی تھے۔ میں نے عرض کیا، اے اللہ کے رسولؐ! ناقلین حدیث نے آپ کی بہت سی حدیثیں ہم کو سنائی ہیں، لیکن میں آپ سے بھی سننا چاہتا ہوں تاکہ وہ میرے لئے دنیا میں باعث شرف و عزت اور آخرت میں باعث ذخیرۂ ثواب ہو۔ آپؐ نے فرمایا، "اے شیخ!" آپ نے مجھے شیخ کا لقب عطا فرمایا۔"

چنانچہ اس لقب سے امام شیرازی بہت خوش ہوتے تھے۔ امام شیرازی ۱۷ سال تک اپنے وطن فیروزآباد میں مقیم رہے۔ اس عمر تک کے اُن کے حالات ہم سے پوشیدہ ہیں لیکن ظاہر ہے کہ سن شعور کو پہنچتے ہی وہ طلب علم میں لگ گئے ہوں گے۔

اس مدت میں انہوں نے امام ابو عبداللہ محمد بن عمر شیرازی سے علم حاصل کیا۔ فیروزآباد میں سب سے پہلے انہی سے شیرازیؒ نے اکتساب فیض حاصل کیا۔

۴۱۰ھ میں طلب علم کے لئے شیرازی نے وطن کو چھوڑا اور شیراز پہنچے اور ایک مدت تک وہاں کے شیوخ اور علماء سے استفادہ حاصل کرتے رہے مثلاً ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ بیضاوی، ابن رامین وغیرہ۔ یہ دونوں حضرات امام ابوالقاسم کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ وہاں سے آپ فندجان تشریف لے گئے وہاں آپ کی ملاقات امام فندجانی سے ہوئی جو امام ابو حامد اسفرائینی کے شاگردوں میں سے ہیں۔

فندجان سے آپ بصرہ تشریف لے گئے اور ایک مدت تک امام خرزی سے علم فقہ حاصل کرتے رہے شوال ۴۱۵ھ میں آپ بغداد تشریف لے گئے اور یہاں سے آپ کی زندگی کا ایک یادگار دور شروع ہوا۔ بغداد میں آپ تقریباً دس سال علم شافعی امام، قاضی ابوالطیب الطبری طاہر بن عبداللہ بن عمر کی خدمت میں رہے، حتی کہ امام طبری ان کے علم و تقویٰ سے مطمئن ہو گئے اور انھیں اپنا نائب بنا لیا، درس و تدریس کی اجازت دی اور ایک دن اپنی جگہ پر انھیں درس دینے کے لئے فرمایا۔ امام شیرازی نے قبول فرما لیا۔ رفتہ رفتہ آپ کی شہرت پھیلنے لگی، اور آپ فقہ، اصول فقہ اور بحث و مباحثہ میں مشہور ہو گئے۔ یہاں تک کہ بغیر کسی مجادلہ اور نزاع کے پانچویں صدی ہجری میں شافعی مسلک کے امام وقت بن گئے۔ ۴۵۰ھ میں اپنے استاذ امام طبری کی وفات کے بعد ان کی جگہ لے لی۔

۴۵۵ھ میں نظام الملک نے خاص امام شیرازی کے درس کے لئے بغداد میں ایک مدرسے کی بنا ڈالی۔ جب ۴۵۹ھ میں مدرسے کی تعمیر مکمل ہو گئی تو اس نے امام شیرازی سے درس کے لئے درخواست کی، شیرازی نے قبول نہ کیا کیونکہ انھیں معلوم ہوا تھا کہ تعمیر میں بعض چیزیں غصب شدہ ہیں۔ جب اصرار بہت بڑھا تو آپ نے ناچار قبول فرما لیا اور درس دینا شروع کیا یہاں تک کہ ۴۷۶ھ میں عالم عدم ملک ہوئے۔

امام شیرازی کی زندگی کے پانچ مراحل ہیں۔

۱۔ فیروزآباد میں ۳۹۳ھ سے ۴۱۰ھ تک۔

۲۔ شیراز، فندجان اور بصرہ میں ۴۱۰ھ سے ۴۱۵ھ تک۔

۳۔ ...

۴۔ جب مدرسہ نظامیہ میں شامل ہو گئے ۴۳۰ھ سے ۴۵۹ھ تک۔

۵۔ ۴۵۹ھ سے ۴۷۶ھ میں جب کہ آپ کی وفات ہو گئی۔

اس مختصر مضمون میں شیخ کی پوری زندگی کے بارے میں آنا محال ہے لیکن کچھ وضاحتیں مناسب معلوم ہوتی ہیں۔

امام شیرازی کا زمانہ فتنوں اور آزمائشوں سے بھرا ہوا تھا سیاسی اعتبار سے بنو بویہ اور دینی اعتبار سے شیعہ غالب تھے۔ حتی کہ خلیفۂ وقت اُن دونوں گروہوں کے ہاتھ کٹھ پتلی بن کر رہ گیا تھا ۴۴۷ھ میں بغداد پر طغرل بیگ حملہ آور ہوا اور بنو بویہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس طرح سلجوقی حکومت جو اہل سنت کے نام سے ظاہر ہوئی تھی شروع ہوئی۔ لیکن فتنوں کا خاتمہ نہ ہوا۔ اب سنی شیعہ فتنے کے ساتھ اشاعرہ اور حنابلہ کے درمیان بحث و مباحثہ اور مناظرہ شروع ہو گیا۔

علم حصول کے سلسلے میں آپ کا طریقہ تھا کہ خود فرماتے ہیں:

میں ہر قیاس کو ایک ہزار مرتبہ لوٹاتا اگر اس سے دل مطمئن ہو جاتا تب دوسرے قیاس کا مسئلہ کو دیکھتا۔ درس کے مطالعہ کے وقت اگر درمیان میں کوئی شعر آجاتا تو آپ اس شعر کا پورا قصیدہ زبانی یاد فرما لیتے۔

علم، حصول علم اور تبلیغ علم میں آپ اس قدر مشغول و مصروف رہتے تھے کہ ایک مرتبہ آپ نے باقلا کے پانی سے بنا ہوا ثرید کھانا چاہا۔ فرماتے ہیں کہ کثرت اشتغال کے سبب مجھے اس کے کھانے کا موقع تک نہ مل سکا۔

ابوبکر شاشی فرماتے ہیں: شیخ ابو اسحاق اللہ وقت پر اللہ رب العزت کی حجت اور دلیل ہیں امام ابوالحسن ماوردی صاحب "الحاوی" فرماتے ہیں، میں نے ابو اسحٰق سا کوئی نہ دیکھا اگر امام شافعیؒ زندہ ہوتے اور آپ کو دیکھتے تو آپ سے بے حد خوش ہوتے۔

آپ کے زہد و تقویٰ کا یہ عالم تھا کہ ایک مرتبہ مسجد میں وضو کرنے کے لئے داخل ہوئے۔ آپ کا ایک دینار گر گیا آپ بھول گئے۔ یاد آنے پر لوٹے تو اُسے وہیں پایا۔ تو کچھ دیر غور و فکر فرمایا پھر کہا، "شاید یہ میرے علاوہ کسی اور کا گر گیا ہے" یہ کہہ کر چھوڑ دیا۔

آپ نے ہر علم و فن پر کتابیں لکھیں چنانچہ فقہ میں المہذب لکھی جس کی ۵ اشرحیں لکھی گئیں۔ اس کے علاوہ التنبیہ لکھی جس کی ۷۰ شرحیں لکھی گئیں۔

اصول فقہ میں التبصرۃ، اللمع اور شرح اللمع لکھی بحث و مباحثہ میں الملخص اور المعونۃ اور خلاف مناظرہ میں النکت، تذکرۃ الخلاف لکھی نیز وہ مناظرے ہیں جو آپ کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان ہوتے تھے۔

تراجم میں آپ کی کتاب طبقات الفقہاء ہے۔ اور عام تالیفات نصحیہ اہل العلم، الفتاوی، ... المسائل اور العدد ہیں۔

یہ آپ کی مؤلفات میں سے چند ہیں ہو سکتا ہے کہ اس کے علاوہ اور بھی ہوں جو ہمارے علم میں نہیں ہے۔

امام شیرازی کا انتقال ابوالمظفر ابن رئیس الرؤساء کے گھر میں، بروز اتوار جمادی الآخر کی اکیسویں تاریخ کو ۴۷۶ھ میں ہوا۔

امام ابوالوفاء حنبلی نے آپ کو غسل دیا اور دارالخلافہ (بغداد) میں باب الفردوس کے پاس نماز جنازہ پڑھی گئی۔ خلیفۂ وقت مقتدی بامر اللہ عباسی بھی موجود تھا۔ وہ آپ کا بڑا معتقد اور آپ سے بے حد خوش تھا۔ نماز جنازہ ابوالفتح مظفر رئیس الرؤساء نے پڑھائی۔ پھر جامع قصر میں دوبارہ آپ کی نماز جنازہ پڑھی گئی اور باب الحرب کے باب دار بزیں آپ سپرد خاک کئے گئے۔ رحمۃ اللہ علیہ

ثم انقضت تلک السنون واہلہا
فکانہا وکانہم احلام

(پھر وہ سال اور وہ سال والے چلے گئے، تو گویا وہ سال اور سال والے خواب ہیں۔)

■■

ابوالبیان حماد

طلبائے ندوۃ العلماء کے نام

زخمِ جگر ہے خوں چکاں دل بھی فگار اور ہے
نکہتِ نیم جاں کی حالتِ زار اور ہے

لالہ و گل نظر فریب چھوٹے نہ دامنِ شکیب
جلوۂ یار کی قسم جلوۂ یار اور ہے

چرخِ بریں سے پرے سدرہ سے اور ماورا
مردِ خدا کا مستقر اور دیار اور ہے

یوں تو بہت علوم ہیں یوں تو بہت فنون ہیں
گلشنِ علم دین کی فصلِ بہار اور ہے

سیم و گہر میں کہاں تیغ و تبر میں یہ کہاں
دل کا سکون اور ہے دل کا قرار اور ہے

عیش و نشاط ہی فقط مقصدِ حیات نہیں
مقصدِ حیات اور ہے اسکی پکار اور ہے

سوز و گداز سے تہی مسجد و مدرسہ سبھی
حق کا طریق اور ہے اسکا وقار اور ہے

عشق رہا نہ اب جنوں چھا گیا عقل کا فسوں
اصلِ حقیقت اور ہے نقش و نگار اور ہے

پھوٹ رہی ہے ظلمتِ یاس سے آس کی کرن
پھولے پھلے الٰہی ندوہ علم کا چمن

حضرت کعب بن مالکؓ

"امتحاں عاشق کا ہوتا ہے منافق کا نہیں"

شمس الحق ندوی

میرے باغ کھجور سے لدے ہوئے تھے کھجوریں رس بھری تیار تھیں، شہر میں دوستوں اور آشناؤں کی بھی کمی نہ تھی، زندگی خوشحال و باغ و بہار تھی، ایسی اس سے قبل کبھی اور آسا سکون و مالداری نہ تھا گھر میں بیوی بچوں کی چہل پہل تھی اور شہر میں مخلص دوستوں اور ملنے جلنے والوں کی ہنسی کھیلتی محفلیں، یہ سب کچھ تھا مگر میں رنج و غم، درد و الم کے ایک بحر بے کنار میں غوطے کھا رہا تھا جس کسی کو آواز دیتا اور اسکی طرف ہاتھ بڑھاتا وہ سنی ان سنی کر دیتا اور اپنا ہاتھ کھینچ لیتا۔

سورج حسب معمول نکل رہا تھا اور اپنی تابناک کرنوں سے کوہ و بیاباں سب کو یکساں منور کر رہا تھا غریب کے جھونپڑے سے لے کر امراء و شاہوں کے محلات تک کو جگمگا رہا تھا مگر میرے دل کی دنیا میں گھپ اندھیرا تھا میری نگاہوں میں دنیا اتنی تیرہ و تاریک تھی کہ ظلمت شب اور دن کے اجالے میں کوئی تمیز نہ ہوتی تھی جس سمت کو نکلتا جہاں کہیں بھی جاتا اداسی و مایوسی میری رفیق اور ہجوم رنج و غم میرا پاسباں ہوتا۔ دل کو ہزار امیدیں دلاتا اور سنبھالتا، اصحاب دعا سی کو بھرتا ہوں میں کرتا اور مسجد میں پہونچ جاتا۔ خوف و یاس، بیم و رجا کے عالم میں (فداہ ابی و امی) اپنے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب نیت باندھ کر کھڑا ہو جاتا۔

زبان اور ہاتھ پاؤں نماز کے ظاہری ارکان ادا کرنے میں مصروف ہوتے، مگر دل و دماغ کہیں اور نگاہیں چپکے چپکے ماہ انور کی طرف بے اختیار پھر جاتیں کہ دیکھوں حضور مجھے دیکھ رہے ہیں کہ نہیں۔ حضور مجھے دیکھ رہے ہوتے تھے مگر جیسے ہی آپ پر نظر پڑتی منہ پھیر لیتے، نہ مجال گفتار تھی نہ جرأت دیدار، دل بھر آتا آنکھوں میں آنسو امڈ آتے۔ ہونٹ تھرتھرا کے رہ جاتے اور بس......

اس سے تسکین ضرور ہوتی اور کچھ ذرا سی ڈھارس بندھتی کہ ؎

وہ بے رخی سے دیکھتے ہیں دیکھتے تو ہیں

مگر تسکین کا یہ سامان بھی کچھ زیادہ ساتھ نہ دے سکا کہ سکوت...... کہ ہم تینوں (بلال ابن امیہ اور مرارہ ابن الربیع اور میں) سے گفتگو کرنا بھی ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اب جس کسی کا سامنا ہوتا گفتگو تو کجا بلکہ ہم کو دیکھ کر رُخ پھیر لیتا ؎

میں تھا اور دشت حشر کا سناٹا
کوئی آواز دُور دُور نہیں

زمین اپنی وسعت کے باوجود ہم پر تنگ و تاریک ہو گئی جیسے ہر شئی اپنی کشش و رعنائی کھو چکی ہو، گو یہ دن موسم بہار کے تھے مگر بہار کا نکھار میری نگاہوں سے اوجھل تھا، اب نہ مجھے اپنی فصلوں اور لدے پھندے کھجوروں کا ہوش تھا نہ کسی اور شئے کا، اور ہو بھی تو کیونکر جب کہ وہی ناراض تھے جو جان بہار ہیں۔ انہیں کی نسبت سے بہار، بہار ہے گلشن گلشن ہے یہی ایک نسبت درمیان سے ہٹ جائے تو بس ویرانہ ہی ویرانہ اور وحشت ہی وحشت ہے ؎

پاس اگر تو نہیں شہر ہے ویراں تمام
تو ہے تو آباد ہیں اجڑے ہوئے کاخ و کو

کرب و بے چینی کی گھڑیاں گذرتی رہیں اسی عالم میں اپنے چچازاد بھائی ابو قتادہؓ کے باغ میں داخل ہوا یہ مجھے بہت زیادہ محبوب تھے اور ہم دونوں کا گہرا یارانہ تھا۔ مگر جب میں نے ان کو سلام کیا تو خاموش رہے اور بزبان حال کہا کہ ؎

یہی جواب ہے اس کا کہ کچھ جواب نہیں

میں نے کسی طرح دل کو سنبھال کر انھیں قسم دلا کر پوچھا کہ ابو قتادہ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ میں اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت کرتا ہوں پھر بھی کچھ جواب نہیں، جب سہ بارہ ان سے پوچھا تو بڑی بے اعتنائی سے بولے کہ اللہ اور اس کے رسول زیادہ بہتر جانتے ہیں۔ ان کا یہ جواب سنکر دل بھر آیا اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور میں حیران و سرگرداں الٹے پاؤں واپس ہوا ابھی تک امتحان محبت کی منزلیں طے نہ ہوئی تھیں میں کھویا کھویا سا ؎

دل عاشق ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتے ہیں

کے عالم میں مدینہ کے بازار سے گذر رہا تھا کہ شامی نبطی تاجر بآواز بلند پوچھ رہا تھا، کوئی کعب کا پتہ بتا دے اس کی آواز پر لوگ میری طرف اشارہ کرنے لگے وہ لپک کر میرے پاس آیا اور ملک غسان کا ایک خط میرے حوالہ کیا۔ جس میں لکھا تھا کہ (خدا نے تم کو بے یار و مددگار نہیں پیدا کیا ہے تم میرے پاس آجاؤ تمہارا اکرام کریں گے، تمہاری صلاحیتوں کی قدر کریں گے۔

میں نے خط پڑھا تو فوراً سمجھ گیا کہ ؎

ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

اور اسی وقت چولہے میں ڈال کر جلا دیا اور ہونٹھ یوں حرکت کرنے لگے ؎

امتحاں عاشق کا ہوتا ہے منافق کا نہیں

امتحان و آزمائش کے ۴۰ دن گذر چکے تھے اور وحی کا سلسلہ بند تھا، ہم لوگوں کا کوئی فیصلہ نہ ہوا تھا قطعی دور ابتلاء ہی چل رہا تھا۔ چالیسویں دن میرے محبوب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا قاصد پیام لایا کہ تم تینوں اپنی بیویوں سے الگ رہو بات واضح نہ ہو سکی میں نے پوچھا کیا طلاق دے دوں یا کیا مطلب ہے؟

قاصد نے کہا بس الگ رہو۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا تم اپنے میکے چلی جاؤ اور جب تک کوئی فیصلہ نہ ہو وہیں رہو۔ ہم تینوں میں بلال ابن امیہ بوڑھے اور کمزور تھے مزید برآں اس امتحان نے ادھ موا حال کر دیا تھا کہ حرکت دشوار تھی کوئی خادم تھا نہ غلام۔ اہلیہ نے حضورؐ سے خدمت کی اجازت مانگی تو مل گئی۔ یہ دیکھ کر میرے بہی خواہوں نے مجھ سے بھی کہا کہ تم بھی اجازت لے لو۔ میں نے ان کے مشورہ کو رد کرتے ہوئے کہا کہ میں اسکو برداشت کر سکتا ہوں حضورؐ سے عرض کرنے کی جرأت نہیں الگ رہنا آسان ہے کچھ عرض کرنا مشکل۔

اسی طرح ہمارے ہمدردوں نے اس وقت بھی ہمیں بڑی ملامت کی تھی جب میں نے جنگ میں شریک نہ ہونے کی وجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ٹھیک ٹھیک بتادی تھی اب لوگ مجھ سے یہی کہتے رہے کہ جس طرح دوسرے لوگوں نے عذر و معذرت کرکے اپنے کو عتاب سے بچا لیا تم بھی بچا لیتے۔ جھوٹ کی معافی کے لئے حضورؐ کا استغفار تمہارے لئے کافی تھا۔ مجھ سے اتنا اصرار ہوا تھا کہ پوچھنے پر بلال ابن امیہ اور مرارہ ابن الربیع کا نام اس عتاب میں شریک ہونے کا نہ لیا گیا ہوتا تو میرے قدم ڈگمگا جاتے اور میں بھی ہلاک ہونے والے منافقین میں شامل ہو جاتا مگر قسمت کی یاوری اور عشق کی رہبری نے ساتھ دیا اور اس ہلاکت سے بال بال بچ گیا سچ ہے عشق میں شورہ پشتی نہیں۔ دنیا تاریک تھی باہر کے لوگوں کی نگاہیں پہلے ہی سے بدلی اور پھری ہوئی تھیں اب شریک حیات تک سے ملنا ممنوع ہو گیا جو کسی قدر باعث تسکین و تسلی تھا، امتحان مشکل سے مشکل تر ہو گیا۔

اور بات صرف اتنی تھی کہ حضورؐ نے جب غزوۂ تبوک کا ارادہ فرمایا تو خلاف معمول پہلے سے سب کو اطلاع کر دی اور تیاری کا حکم دے دیا سب نے تیاری کر لی اور میں آج کل پر ٹالتا رہا کہ خدا نے دے رکھا ہے جب چاہوں گا تیاری ہو جائے گی بازار جاتا اور کوئی تیاری نہ ہوتی وقت یوں ہی گذرتا رہا تا آنکہ کوچ کا دن آگیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی اتنی بڑی جمعیت کے ساتھ نکلے کہ ان کا شمار مشکل تھا، ان نکلنے والوں کی کوئی لسٹ تھی نہ اندراج، جو شخص نہ جانا چاہتا وحی کے بغیر اس کا معلوم ہونا مشکل تھا لوگ چلے گئے اور میں آج کل ہی کرتا رہا اور یہ خیال ہوا کہ اب بھی تیز سواری سے جاؤنگا اور راستہ میں جا ملوں گا۔ اور کاش ایسا کر لیا ہوتا۔

اب جب میں مدینہ کی گلیوں میں نکلتا تو سوائے معذورین و منافقین کے کوئی نظر نہ آتا یہ صورت حال شرم سے پانی پانی کر دیتی، کمبخت تقدیر نے اب بھی نہ کچھ کرنے دیا۔ حضورؐ نے راستہ میں مجھے کہیں نہ پوچھا تبوک پہنچکر تشریف فرما تھے کہ مجھے یاد فرمایا۔ ایک نے فرمایا کہ ان کو ٹیپ ٹاپ نے نہیں نکلنے دیا مگر میرے مخلص معاذ بن جبلؓ نے میری طرف سے دفاع کیا اور فرمایا بڑی نازیبا بات کہی۔

میں سفر نہ کر سکا اور حضورؐ کی واپسی کی خبر آگئی اب میں حیران تھا کہ اپنے محبوب کو کیا منھ دکھاؤں اور سامنا کیونکر ہو، بہت غور و فکر کیا ہر چھوٹے بڑے سے مشورہ لیا مگر دل میں کوئی بات نہ جمی جھوٹ بول کر بچنا چاہتا تو میرے لئے آسان تھا خدا نے مجھے قوت گویائی کا اچھا ملکہ عطا فرمایا تھا، مگر دل میں یہ خیال رہ رہ کر چٹکی لیتا کہ اگر وحی کے ذریعہ حضورؐ کو اطلاع ہو گئی تو کیا کرو گے۔ بالآخر میں نے صحیح صورت حال بیان کرنے کا فیصلہ کر لیا، اور حقیقت حال ہی عرض کی۔

دن اسی ابتلاء و آزمائش میں گذر رہے تھے جو اوپر ذکر کیا کہ ہمارے امتحان کا پچاسواں دن آگیا اور وحی الٰہی نے ہماری برأت کا اعلان کیا اور ہماری توبہ کی قبولیت کا اعلان ہوا۔ "وعلی الثلٰثۃ الذین خلفوا"۔ نماز صبح کے بعد جب سورج اپنی کرنوں کو بکھیرنے کی تیاری میں تھا ہماری بھی شب تاریک کی سحر کا اعلان ہوا۔ آپؐ نے نماز کے بعد صحابہؓ کو خبر کی۔ پھر کیا تھا ہمارے مخلصوں کے چہروں پہ ہنسی کھیلنے لگی اور ہر ایک کی یہ آرزو ہوئی کہ وہ سب سے پہلے مجھ کو یہ خوشخبری سنائے کسی نے گھوڑے کو ایڑ لگائی کسی نے اس میں بھی تاخیر سمجھی پہاڑ پر چڑھ کر اعلان کیا۔ میں اپنے مکان کی چھت پر بیٹھا تھا، آواز سنکر رنج و غم کے بادل چھٹ گئے، مسرت و شادمانی نے گلے لگایا۔ فرط مسرت سے بے ساختہ سجدہ میں پڑ گیا ذرا دیر میں پہاڑ سے آواز دینے والا میرا مخلص میرے پاس آچکا تھا، میں نے غایت خوشی میں اپنے جسم کا لباس اُسکو دے دیا اور خود مستعار کپڑے لے کر پہنے کہ اس وقت میرے پاس ایک ہی کپڑا تھا، اب دربار رسالتؐ میں حاضری کے لئے نکلا لوگ جھوم جھوم کر جوق در جوق ملتے اور مبارکباد دینے لگے یہاں تک کہ مسجد میں داخل ہو گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما تھے لوگ حلقہ بنائے بیٹھے تھے، مجھے دیکھتے ہی حضرت طلحہ بن عبید اللہ لپک کے میری طرف بڑھے مصافحہ کیا اور مبارکباد دی حضورؐ کی طرف بڑھا تو چہرۂ انور دمک رہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا جب سے تم پیدا ہوئے اس وقت سے اب تک کی مبارک ترین گھڑی کی خوشخبری سنو۔ حضورؐ کا یہ حال تھا کہ جب خوش ہوتے تو چہرۂ انور

(بقیہ صفحہ ۲۳ پر)

قسط ۲

ندوۃ العلماء کا ۸۵ سالہ جشن تعلیمی

از: مولانا عبد الرؤف رحمانی جھنڈانگری (ناظم جامعہ سراج العلوم جھنڈانگر نیپال)

مولانا علی میاں مدظلہ کی الوداعی تقریر:

اس کے بعد حضرت مولانا علی میاں صاحب مدظلہ نے الوداعی تقریر فرمائی جس میں مولانا نے جلالی انداز میں فرمایا کہ میں کس کس کا شکریہ ادا کروں جن جن حضرات نے اس اجلاس میں حصہ لیا ہے اور اپنی سعی صرف کی ہے ان کا نام میرے شکریے سے بھی بالاتر ہے، میرے دل کے جو جذبات ہیں الفاظ اس کی ادائیگی سے قاصر ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ میرے الفاظ شکریہ کا حق ادا نہ کر سکیں گے، اور نام لے کر میں شکریہ ادا کرنے کی قباحت کو خوب جانتا ہوں، کتنے خدا کے بندے ایسے ہونگے جنھوں نے پوری محنت اور انتہائی جانفشانی سے اس کام کو سلجھایا ہوگا کہ میں ان کے نام تک سے واقف نہیں تو شکریہ کیسے ادا کروں۔ کتنے خدا کے بندے ایسے ہیں جنھوں نے اس اجتماع کی جھلک بھی نہ دیکھی ہے لیکن وہ شب و روز مسجدوں میں بیٹھے ہوئے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعائیں مانگ رہے ہیں انہی بزرگوں کے دعاؤں کی یہ برکت ہے کہ اتنا عظیم مجمع اس سکون و اطمینان سے انجام بخیر ہوا پھر اسی ضمن میں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب مدظلہ اور رئیس التبلیغ مولانا انعام الحسن صاحب کا نام نامی لیا۔

آخر میں مولانا نے بہوگنا جی کا شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ میں کھل کر اعتراف کرتا ہوں کہ اُن کے منسٹریشن اور لکھنؤ کارپوریشن نے پوری تندہی سے اس اجتماع کو تعاون دیا ہے۔ ایک ایک کانسٹبل جنھوں نے رات دن ایک ایک کرکے آپ کی خدمت کی ہے وہ بھی ہمارے شکریے کا مستحق ہے۔ نوٹ کرنے والے نوٹ کر لیں اور چھاپنے والے چھاپ دیں میں بہوگنا جی کا اور ان کے ایڈمنسٹریشن اور کارپوریشن کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ یہ تقریر مولانا نے کچھ ایسے جلالی انداز سے فرمائی کہ مجمع پر ایک سحر طاری ہو گیا اور لوگ خوشی سے تالیاں بجانے لگے اور تالیوں کے پُرشور آواز میں ڈوب کر مولانا کی آواز پھر ابھری۔

لیکن ہم اتنے اوچھے نہیں ہیں کہ کسی کے ہاتھ بک جائیں، ہم اپنی روایات اور اعلیٰ قدروں کی حفاظت کرنا جانتے ہیں، اگر مجھے بکنا ہوتا تو میں پاسبان حرم فیصل مرحوم کے ہاتھ بکا ہوتا۔ لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے ہر جگہ اپنی ضمیر کی حفاظت کی ہے رسول خدا کا ارشاد ہے کہ تمہیں کوئی ایک لوٹا پانی دیدے تو وہ بھی تمہارا مہربان اور شکریے کا مستحق ہے۔ بہوگنا جی نے بہت کچھ کیا ہے ان کا شکریہ کیسے نہ ادا کروں۔ ان الفاظ کے ساتھ دعاؤں پر اس مجلس کا اختتام ہوا۔

مجلس ابنائے قدیم: بعد نماز ظہر ندوہ کے ابنائے قدیم ([illegible]) اجتماع ہوا جسمیں مولانا نے ندوہ کے ابنائے قدیم کو اپنا مشورہ دیا کہ آپ ندوی ہیں، ندوہ کے امتیازی مقام کو برقرار رکھیں اور اپنے کیرکٹر سے ندوہ کے فیض تربیت کا مثالی نمونہ بن جائیں۔

اور آپ کو ندوی کہلانے میں کوئی جھجک نہیں محسوس کرنی چاہئے۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اپنے مخالف کے لئے کبھی رکیک اور مبتذل الفاظ ہرگز استعمال نہ کیجئے اسی ذیل میں اپنا ایک واقعہ بیان کیا کہ میں نے رد قادیانیت میں ایک کتاب لکھی تو قادیانیوں کے سرکاری آرگن الفضل میں اس پر ریویو ہوا تو اڈیٹر نے لکھا کہ اس کتاب میں ایک خاص بات قابل ذکر ہے کہ اس میں نہ تو ہمارے نبی کے لئے کوئی رکیک لفظ لکھا گیا ہے اور نہ ہماری تحریک کے لئے مبتذل الفاظ استعمال کئے گئے ہیں بجز اس کے کہ کتاب کا نام "قادیانیت" رکھا گیا ہے جو اشتعال انگیز ہے اگر ہم بھی کسی موقعہ پر ندوی یا ندویت جیسا لفظ لکھیں تو بھلا مولانا کو کیا لگے گا، اور شرافت تحریر کا یہ عالم ہے کہ ابتذال اس کتاب کو چھو بھی نہیں گیا ہے، اب اس طریقہ کو آپ لوگ بھی اپنائیں کہ دشمن بھی آپ کی ان خوبیوں کا اعتراف کرے۔

(الفضل ما شهدت به الأعداء) ان الفاظ کے ساتھ مولانا اپنے فرزندوں سے رخصت ہوئے ؎

اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

جشن تعلیمی کے دیگر ظاہری انتظامات:

اس عظیم الشان جشن تعلیمی کے شایان شان وسیع پنڈال اور خوبصورت و دیدہ زیب اسٹیج تھا پورا پنڈال رات میں بقعۂ نور بنا ہوا تھا، کرسیاں بڑی سلیقہ مندی سے بچھائی گئی تھیں، مہمانوں کے قیام طعام کا ایک نہایت شائستہ و معقول انتظام تھا۔ پانی کی وافر مقدار میں سپلائی، استنجا خانوں و پاخانوں کی ستھرائی، رضاکاروں و والنٹیروں کی مستعدی و چابکدستی قابل تعریف حد تک نمایاں تھی، ملک کے گوشہ گوشہ سے ارباب فضل و اصحاب علم، پروفیسر، لکچرر، ڈاکٹر، وائس چانسلر، صحافی، مشائخ ہر طبقہ کے لوگ اچھی بڑی کثرت سے شریک ہوئے اور پھر بلاد عرب کے نمائندے اور اہل فضل اس کثرت سے جمع ہوئے کہ اب تک کوئی ادارہ یا انجمن اتنی کثیر تعداد میں بیرونی مہمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع نہ کر سکا تھا۔

بقیہ صفحہ ۲۲

چہرہ ہیں کہ چاند کی طرح دمکتا چہرہ دیکھ کر ہم لوگ خوشی کو سمجھ لیتے تھے، پھر جب میں آپ کے سامنے بیٹھا تو عرض کیا کہ اے اللہ کے نبیؐ توبہ کی اس قبولیت کی خوشی میں، میں اپنے مال میں سے اللہ و رسول کے نام پر صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا ضرور کچھ باقی بھی رکھو۔ چنانچہ خدا کے اس انعام عظیم پر جو دولت ایمان کے بعد سب سے بڑا انعام تھا خیبر کا حصہ روک کر سب راہ خدا میں دے دیا۔

محبت و فدائیت کی یہ داستان لکھتے ہوئے اب قلم جہاں پہنچا ہے ایک سوالیہ نشان بن کر آگے چلنے سے رُکتا ہے اور پوچھتا ہے کہ وہ بے ارادہ خطا پر ایسے نادم و شرمسار تھے کہ دل میں آقا کی طرف سے ملال و شکایت کا کوئی ادنیٰ شائبہ تک نہ آیا خود کو مجرم ہی سمجھ رہے تھے۔ مگر تمہاری زندگی اعدا ہی توم کے جن افراد کو یہ قصہ محبت نظر کر رہے ہیں انھی کی زندگی کے رنگ ڈھنگ کیا ہیں۔ حضورؐ کے فرمان کے مطابق جب ہر فرد امت کے اعمال پیش ہوتے ہوں گے تو کیا گذرتی ہوگی۔ خیر ان کا کیا شکوہ جب خود تمہارے ہاتھوں سنتیں مٹ رہی ہیں، رونا آنسو بہانا تو کیا شعور و احساس تک نہیں۔ ان فدائیوں کے حالات و قصے تو اسی لئے ہیں کہ تمہاری زندگی میں کوئی حرکت، جوش، ولولہ اور قوت پیدا کریں۔ مگر تمہارا حال یہ ہے کہ ؎

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

یہ کہتے کہتے قلم کی زبان خشک ہو گئی، یہ دم بخود کسی فکر میں گم ہو گیا، سوال کا کچھ جواب نہ بن پڑا۔ ★★

خوش خبری

اردو زبان میں ہومیو پیتھک علاج پر اپنے طرز کی واحد کتاب
آئینہ ہومیو پیتھی

مصنفہ عالیجناب ڈاکٹر مرزا محمد امین صاحب شائع ہو گئی جس میں سر سے لیکر پاؤں تک تمام امراض کی تشخیص، اسباب، پرہیز اور مکمل علاج دیا گیا ہے۔ اس قدر عام فہم اور آسان کتاب اس موضوع پر آج تک شائع نہیں ہوئی۔ کتاب ہذا کو پڑھ کر ایک معمولی پڑھا لکھا آدمی بھی اپنا اور اپنے خاندان والوں کا علاج نہایت آسانی سے کر سکتا ہے ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کے لئے یہ کتاب نعمت غیر مترقبہ ہے۔ آج ہی خریدیں ورنہ دوسرے ایڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

صفحات تقریباً ۵۰۰ قیمت مجلد مع ڈسٹ کور بیس روپیہ Rs. 20/-
محصول ڈاک علیحدہ

ملنے کا پتہ
خورشید بکڈپو ہومیو پیتھی ہاؤس [illegible] امین آباد لکھنؤ

بیماری کے بعد کی کمزوری کو جلد دور کرتی ہے۔

دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ